

دیوانِ حالی

الطاف حسین حالی



ہماری شاہکار کتب

۱۳۰/=	ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی	الاسماء الحسنیٰ
۲۵۰/=	اعظم چشتی	کلیات اعظم
	محمد علی ظہوری	کلیات ظہوری
۱۳۰/=	ریاض حسین چودھری	رزقِ ثناء (ایوارڈ یافتہ)
۱۰۰/=	زابد فخری	محمد ﷺ محمد ﷺ
۳۰۰/=	احسان دانش	جہان دانش
۳۵۰=	احسان دانش	جہان دگر
۱۶۰/=	احسان دانش	زنجیر بہاراں
۱۵۰/=	قتیل شفقانی	صندل
۱۵۰/=	مظفر وارثی	تنہا تنہا گزری ہے
۱۵۰/=	مظفر وارثی	گئے دنوں کا سراغ
۱۳۰/=	سید ارشاد احمد عارف	دیوار چین کے اس پار
۲۵۰/=	شوکت علی شاہ	جزیرے جمال کے
۱۵۰/=	شوکت علی شاہ	اجنبی اپنے دیس میں
۲۵۰/=	شوکت علی شاہ	سلکتے ساحل
۱۵۰/=	حسن رضوی	خواب سہانے یاد آتے ہیں
۱۳۰/=	حسن رضوی	پیارے
۴۰۰/=	سعد اللہ شاہ	سبز توں کی جھلمل میں
۴۰۰/=	سعد اللہ شاہ	مجھے بادل اٹھالائے
۴۰۰/=	سعد اللہ شاہ	ابھی تک آنکھ ہے پر نم
۱۵۰/=	سعد اللہ شاہ	بادل چاند ہو اور میں
۱۵۰/=	سعد اللہ شاہ	تہی ملتے تو اچھا تھا
۱۵۰/=	سعد اللہ شاہ	دھوپ کا چاند (نیا شعری مجموعہ)
۱۸۰/=	محمد احمد صابر	اشکوں سے بھری آنکھیں
۲۵۰/=	محمد اسلم راہی	آتش پرست (ناول)
۲۵۰/=	محمد اسلم راہی	باہل و نبیلا (ناول)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے پیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار پیچ

دیوان حالی

منے کے پتے

اسلامی کتب خانہ، فضل الہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
 مکتبہ العلم، ۷۱- اردو بازار، لاہور
 چوہدری بک ڈپو، مین بازار، دینہ
 میاں ندیم، مین بازار، جہلم
 اسلامک بک سنٹر، اردو بازار، کراچی
 دارالادب، تلمبہ روڈ، میاں چنوں
 ضیاء القرآن پبلشرز، گنج بخش روڈ، لاہور
 اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی
 فرید پبلشرز، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی
 شمع بک ایجنسی، فیصل آباد
 کتاب گھر، علامہ اقبال روڈ، راولپنڈی
 ہاشمی برادرز، مشن چوک، کوئٹہ
 نیو الیاس کتاب محل، کچھری بازار، جڑانوالہ
 ڈائمنڈ بک ڈپو، بینک روڈ، مظفر آباد، آزاد کشمیر
 بختیار سنز، قصہ خوانی بازار، پشاور
 ادیس کتاب محل، مین بازار، منڈی سمبڑیال

مکتبہ رحمانیہ، اقرا سنٹر، اردو بازار، لاہور
 سعد پبلیکیشنز، فرسٹ فلور، میاں مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
 کوالٹی ڈیپارٹمنٹ، سٹور، کالج روڈ، بورے والا
 کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال
 بگلش بک ڈپو، اردو بازار، سیالکوٹ
 مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد
 مکتبہ رشیدیہ، نیوجنرل، چکوال
 ضیاء القرآن پبلشرز، اردو بازار، کراچی
 ویکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی
 وہاڑی کتاب گھر - مین بازار، وہاڑی
 یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور
 رحمان بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی
 بک سنٹر، علامہ اقبال چوک، سیالکوٹ
 الکریم نیوز ایجنسی، گول چوک، اوکاڑہ
 منیر برادرز، مین بازار، جہلم
 شانگلہ لائبریری، محلہ چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ

دیوانِ حالی

مولانا الطاف حسین حالی

حضرت علیؑ و اولادہٗ
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور ۷۳۱۴۱۶۹

جدیدہ نزیب اور
خلو بصورت کتب کا
واحد مرکز

ترتیب و اہتمام
نذیر محمد طاہر نذیر



جملہ حقوق محفوظ ہیں

۲۰۰۱ء	سال اشاعت
عبد اللہ	سرورق
محمد نذیر طاہر نذیر	اہتمام
الاشراق کمپوزنگ سنٹر، لاہور	کمپوزنگ
زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور	مطبع
200 روپے	قیمت

فہرست

۱۵ دیباچہ مولانا الطاف حسین حالی

قطععات

۱۵ چھوٹوں کا بڑا ہو جانا

۲۷ شعر کی طرف خطاب

۲۹ مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

۳۱ نکتہ چینی

۳۲ بے تمیزی ابنائے زماں

۳۳ ایک خود پسند امیر زادہ کی تضحیک

۳۶ پولیٹیکل سپیچیں

۳۸ بدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی

۳۹ تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

۴۰ سید احمد خاں کی تکفیر

۴۲ قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت

۴۵ آزادی کی قدر

۴۶ انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

۴۷ سید احمد خاں کی مخالفت

۴۸ قحط اہل اللہ

۴۹

نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

۵۱

نیشن کی تعریف

۵۲

صفائی نہ رکھنے کا عذر

۵۳

دلی کی شاعری کا تنزل

۵۵

بیٹیوں کی نسبت

۵۷

سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

۵۹

یقین

۶۰

استفادہ

لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

۶۳

حسن سازی

۶۴

عقل اور نفس کی گفتگو

۶۷

عادت کا غلبہ عقل پر

۶۸

شعراء کا سلطنت میں دخل دینا

لوگ کسی کی خوبیاں سن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اس کے عیب

۷۰

سن کر

۷۱

شایہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

۷۳

اسراف

۷۴

پاس نیک نامی

۷۴

غرور نیک نام

۷۵

کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

- ۷۷ خود ستائی
- ۸۰ حملہ نفس
- ۸۱ جس قوم میں افلاس ہو اس میں بخل اتنا بد نما نہیں جتنا اسراف
- ۸۳ رؤسائے عہد کی فیاضی
- ۸۵ ایمان کی تعریف
- ۸۶ برکت اتفاق
- ۸۸ بعد صوری مانع قرب معنوی نہیں ہے
- ۹۰ ناصح مخلص اور اہل غرض میں تمیز
- ۹۱ خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں
- ۹۲ خوشامد کرنے کی ضرورت
- ۹۳ رعیت پر نااہل کو مسلط کرنا
- ۹۶ رشک
- ۹۸ قانون
- ۹۹ شادی قبل از بلوغ
- ۱۰۰ امر اور عقلا
- ۱۰۱ عصمت بی بی از بے چادری
- ۱۰۱ سچ کہاں ہے
- ۱۰۲ اپنا التزام دوسروں پر تھوپنا
- ۱۰۲ خوشامد کے معنی
- ۱۰۳ تدبیر قیام سلطنت

- ۱۰۴ مرد اور عورت کی حکومت کا فرق
- ۱۰۵ مغرور کی پہچان
- ۱۰۵ کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد
- ۱۰۶ گدائے مہرم
- ۱۰۷ بے اعتدالی
- ۱۰۹ طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے
- ۱۱۰ اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا
- ۱۱۱ فضول خرچی کا انجام
- ۱۱۳ اختلاف مہب رفع نہیں ہو سکتا
- ۱۱۴ انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ موردِ آفات ہے
- ۱۱۵ چند و بازی کا انجام
- ۱۱۶ قوم کی پاسداری
- ۱۲۰ غزلیات قدیم و جدید
- ۱۲۰ قبضہ ہودلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
- ۱۲۲ کام ہے جوازل سے وہ ہے کمال تیرا
- ۱۲۴ ربڑ میں دشت جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
- ۱۲۶ پردہ ہولا کھ کینہ شمر ویزید کا
- ۱۲۸ یا ملکی الصفات یا بشری القوی (نعت)
- ۱۳۲ اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
- ۱۳۴ دیکھ اے امید کچواہم سے نہ تو کنارہ

- ۱۳۶ رونا نہ ہوگا حالی شاید یہ کم تمہارا
- ۱۳۸ وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
- ۱۴۰ جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا
- ۱۴۲ ہو عزم دیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا
- ۱۴۴ معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
- ۱۴۶ نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
- ۱۴۸ کہیں الہام منوانا پڑے گا
- ۱۵۱ سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
- ۱۵۲ کب تک اے ابر کرم تر سائے گا
- ۱۵۴ واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
- ۱۵۶ کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
- ۱۵۹ راحت کا جہاں میں یونہیں اک نام ہے گویا
- ۱۶۱ خلوت میں تری صوفی گر نور صفا ہوتا
- ۱۶۳ پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
- ۱۶۵ رنج اور رنج بھی تنہائی کا
- ۱۶۸ اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
- ۱۷۰ دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
- ۱۷۲ قلق اور دل میں سوا ہو گیا
- ۱۷۴ سنگ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا
- ۱۷۶ درِ دل کو دوا سے کیا مطلب

- ۱۷۸ مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب
- ۱۸۰ یہ ہیں واعظ سب پہ مونہہ آتے ہیں آپ
- ۱۸۲ گو جوانی میں تھی کج رانی بہت
- ۱۸۳ اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
- ۱۸۶ بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
- ۱۸۸ تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ
- ۱۹۰ باپ کا ہے جھبی پسر وارث
- ۱۹۲ بھید واعظ اپنا کھلوا یا عبث
- ۱۹۳ بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج
- ۱۹۶ تلخی دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج
- ۱۹۸ بزم مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے مے خوار چچ
- ۲۰۰ کاٹھے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
- ۲۰۲ مے مغاں کا ہے چسکا اگر برا اے شیخ
- ۲۰۴ شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
- ۲۰۶ کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد
- ۲۰۸ پیاس تیری بوئے ساغر سے لذیذ
- ۲۱۰ ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر
- ۲۱۲ کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
- ۲۱۵ ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
- ۲۱۷ گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ

- ۲۱۹ عہد وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز
- ۲۲۱ جیتے جی موت کے تم مونہہ میں نہ جانا ہرگز
- ۲۲۶ رنجش و التفات و ناز و نیاز
- ۲۳۰ جاذبِ رحمت ہے مقناطیس عصیاں اپنے پاس
- ۲۳۲ چھیڑا ب نہ اے تصور مرثگان یار بس
- ۲۳۴ اک ہم کو ہم بر سر ایام ہے درپیش
- ۲۳۶ ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
- ۲۳۷ درد اور درد کی ہے سب کے دو ایک ہی شخص
- ۲۳۹ عشق کو ترک جنوں سے کیا غرض
- ۲۴۱ دوست کا ناروا نہیں اعراض
- ۲۴۳ رات گزری ہو چکا دور نشاط
- ۲۴۵ چھپے ہیں حریفوں میں احرار و اعظ
- ۲۴۷ اے بہار زندگی الوداع
- ۲۴۹ کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زراغ
- ۲۵۱ حق نہ ملانے کچھ بتایا صاف
- ۲۵۲ نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لایق
- ۲۵۴ دلوں کا کھوٹ اگر کہیے بر ملا ایک ایک
- ۲۵۶ عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
- ۲۵۸ صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
- ۲۶۰ ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل

- ۲۶۳ مدرسہ میں دہر کے روبرقفا بیٹھے تھے ہم
- ۲۶۴ خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
- ۲۶۷ آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم
- ۲۶۹ یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرا نیاں ہیں
- ۲۷۲ جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
- ۲۷۴ کی تو ہی ہم نے بھی حالی کوچ کی تیاریاں
- ۲۷۶ راز دل کی سر بازار خبر کرتے ہیں
- ۲۷۸ دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
- ۲۸۰ بواہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
- ۲۸۲ پھونکا ہے فصل گل نے صور آ کے پھر چمن میں
- ۲۸۶ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
- ۲۸۸ پیاہم نے نہ جام بے کدورت بزم دوراں میں
- ۲۹۰ اب وہ اگلا سا التفات نہیں
- ۲۹۲ کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غم ہجر اں میں نہیں
- ۲۹۴ غم فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں
- ۲۹۶ میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
- ۲۹۸ وحشت میں تھا خیال گل و یا من کہاں
- ۳۰۰ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
- ۳۰۲ مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو
- ۳۰۴ حکم ہے پیر مغاں کا کہ جوانی نہ نواؤ

- ۳۰۶ در فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ
- ۳۰۸ بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
- ۳۱۱ حقیقت محرم اسرار سے پوچھ
- ۳۱۳ ہے ان کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی
- ۳۱۵ کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
- ۳۱۷ سب و فمیری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
- ۳۱۹ ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
- ۳۲۱ بری اور بھلی سب گزر جائے گی
- ۳۲۳ سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
- ۳۲۵ اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
- ۳۲۷ رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی
- ۳۲۹ وصل کا اس کے دل زار تمنائی ہے
- ۳۳۱ اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
- ۳۳۳ تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی
- ۳۳۴ جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تلف کیجیے
- ۳۳۶ فکر فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
- ۳۳۸ سعی سے بہتر تن آسانی مری
- ۳۴۰ پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
- ۳۴۲ کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گناں رہے
- ۳۴۴ حق و وفا کے جو ہم جتانے لگے

۳۴۶	حشر تک یاں دل شکیبہ چاہیے
۳۴۸	جنوں کا رفرما ہوا چاہتا ہے
۳۵۰	جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادایا در ہے
۳۵۲	ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
۳۵۲	نہ واں پر سش نہ یاں تاب سخن ہے
۳۵۷	دھوم تھی اپنی پارسائی کی
۳۵۹	کر دیا خوگر جفا تو نے
۳۶۱	کر کے بیمار دی دوا تو نے
۳۶۳	دل کو درد آشنا کیا تو نے
۳۶۷	
۴	رباعیات

۴۰۲

۴۰۳

۴

۵۵۳

۵۵۴

۴

۵۷۶

قصیدے، ترکیب بند، مسدس چند اور قطعے
مختلف مضامین پر بہ ترتیب اوقات تحریر
قطععات تاریخ اور تاریخی جملے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا عشق کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا اول تو خود شعر کا حدیث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولہ سے ہوا ہے۔ جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور شعر کی ذات میں جو ایک آتشگیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے۔ پھر قوم اس کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اسی خیال کی تائید کرتا تھا۔ با-نہمہ حادثات سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہد رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیر زال کی صورت میں کیا جائے اور شرابِ ارغوانی کی جگہ سرکہ بے نمک سے ضیافت طبع کی جائے۔ غرضیکہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا۔ بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔ اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بکواس مضاائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیوں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر رہیروں کا تانا بندا ہوا تھا۔ قافلہ کا ساتھ راہ کی ہمواری اور رہگذر کی فضا چھوڑ کر دورِ ارسہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتابِ عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا۔ وہ تمام سیمائی جلوے جو خوابِ غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کا فور ہونے لگے۔ غزل و تشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی۔ اور جس شاعری پہ ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

۱- قوم سے یہاں اس کے متعارف معنی مراد نہیں ہیں بلکہ یہاں قوم سے مراد شعراء ہیں۔

”یقولون^۱ هل قبل الثلثین ملعب فقلت و هل بعد الثلثین ملعب“

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں مونہ کو لوگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دلشکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سنی بہتر ہے۔ اور حاکمِ وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت روچکے۔ کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔

میرہ بحال خویش ہم آخر تو اس گریست تا چند بر فلان و بہ بہماں گریستن کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند۔ مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بتی۔ اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ جو نظمیں کسی قدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی ہیں۔ اب زیادہ تر کچھ نیچے کھچے متفرق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں۔ جن میں سے کسی قدر قطعہ و رباعی کے لباس میں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ ان کے سوا چند ترکیب بند۔ اک آدہ مسمط۔ کچھ قصیدے اور کچھ تاریخیں ہیں۔ جن میں سے اکثر خاص خاص طور پر وقتاً بعد وقت شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں۔ پہلا کلام جو عالمِ جہل و نادانی یا خلاصہ زندگی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا مقتضی ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے سرانجام ہوتا ہے عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو وہ اسکو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرات کرتا ہے۔ اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے جس فخر کے ساتھ کہ وہ اعرابی^۲

۱- یعنی لوگ کہتے ہیں کہ کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہے سو میں نے ان سے کہا کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟

۲- یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بدوی جس نے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزانہ چکھتا تھا اس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے کچھ نسبت نہ رکھتا تھا لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوں ہمیشہ پیا کرتا تھا اس سے کسی قدر میٹھا تھا۔ وہ خوشی خوشی اس کی ایک مشک بھر کر بغداد میں پہنچا اور خلیفہ کے دربار میں اس کو بطور ایک غلقِ نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا مگر اس کی بد مزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اس کو انعام دے کر رخصت کیا اور حکم دے دیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ منے مائے ورنہ اسے دل میں شرمندہ ہوگا۔

جس نے کبھی آبِ شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا ایک کھاری پانی کے چشمہ سے مشک بھر کر ہارون رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لے گیا تھا۔ وہ اس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کلہمبس امریکا دریافت کر کے از بلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ پس یہ تمام مجموعہ جس میں کچھ نئے اور کچھ پرانے خیالات شامل ہیں محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھئے مردود ہو یا مقبول۔ ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر نئے ہم اپنے دعووں پر آپ ہنتے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانہ کے خیالات میں پہلے زمانہ کی نسبت حقائق و واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے۔ اور جیسی کہ امید کجاتی ہے ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے۔ مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں ایسے سچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہم کو بھی معلوم نہیں۔ تا بدیگر اس چہ رسد۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولہ سے ہوتا ہے ویسا ہی بلکہ بعض اوقات اس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش، تحسین و آفرین کے لالچ۔ جلب منفعت کی توقع، یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر چہ ہم اس وقت نہ ہونگے۔ مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ اور پانی کو الگ کیے بغیر نہ رہے گا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا۔ اور جھوٹ برسات کے سبزہ کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔

”و کم قد رأینا من فروع کثیرة تموت اذا لم تحسین اصول“

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیا اور دھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے۔ مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجاء، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست

بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیے اسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے۔ اور اپنی وضع صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کر دے۔ اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کی طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔ اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعہ کو اور نیز ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی ایسے اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں۔ اور نہ طرز بیان ہی میں کوئی ایسی جدت ہے جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور یہ سمجھ کر وہ بے اختیار پکار اٹھیں کہ ”هذا الذي رزقنا من قبل“^۱ پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا میں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں۔ یا کسی کے ذہن کی ان تک رسائی نہ ہو سکے۔ بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و نا شاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت ان کے پیش نظر ہیں۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور متبذل ہیں ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی طرف بہت کم التفات کیا گیا۔ اور پایہ شاعری کو ان سے وراء الوباء سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقہ شاعری کا بھید انھیں متبذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو

۱- قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے ہذا الذي رزقنا من قبل (یعنی یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزہ اور لذت جدا ہوگی۔

بسب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لا سکے۔ اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چونہ کا۔ یا بڑھتی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے۔ اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترغیب دینے میں کسی ایسے مصالِح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مصالِح کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو روز مرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں۔ یا زمین، آسمان، چاند، سورج، پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا مچھر، مکڑی اور بھنگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے۔ پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی۔ اس کی مثال اس معمار کی سی ہوگی جو عمارت بنانے کے لیے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالِح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی۔

”ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست“

الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی، معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھتا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزول ماندہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانہ کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی۔ ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقہ کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورت احوال سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیے گئے۔ کہیں ان کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اس کو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعاً و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیے گئے جو شائد کہیں کہیں مطابہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں مگر انوری، سعدی و

شفائی کے مطالبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریاد و مکرو سالوس و عجب و خود پسندی اور اسی قسم کے اخلاق و اعظ و زاہد و صوفی و شیخ و ملا پر ڈھالے گئے۔ نہ اس لیے کہ نعوذ باللہ اس فرقہ علیہ کی مذمت مقصود تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ان اخلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تر کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبہ جیسا اجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں۔ مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ریاد و عجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ مگر جب اس کو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈرانی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعری کی علت غائی ہے۔

شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اس کو بضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بنا پڑا ہے۔ مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر دکھاتا ہے۔ اور گھر کے بھیدی کی طرح چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔ پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے۔

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اس کو ساری

حالی سے بد گمانی بے جا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہو سکے کہ اس میں فطرت انسانی کے دقائق و

غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جس کی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو وہ پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح نقشہ کھینچ

دیتا ہے کہ خود اس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اسی طرح ایک دوسرا شاعر جس نے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقہ سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا وہ رنود و اوباش کی صحبتوں کا ایسا چہ با اتار دیتا ہے کہ گویا انھیں میں سے ایک کے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ ابونواس نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع سن کر جس میں رات کے تخیلہ اور عیش و عشرت کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا۔ اس مصرع کی تفسیر میں ایسے واقعات بیان کر دیئے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہو کر بے ساختہ یہ کہہ اٹھتا تھا ”قاتلک اللہ کانک کنت نالئنا“ ”شکسپر جس کے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنیوالے تھے اور جس نے کبھی آنکھ کھول کر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی اس نے میکبت، جولیت، کیتھرائن، ڈز چمونا اور بعض اور لیڈیوں کے ایسے اصلی کیرکٹرز دکھائے ہیں جن کا اس سوسائٹی پر جس میں اس کی عمر گزری تھی کبھی پر چھاواں تک نہ پڑا تھا۔ ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس، رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکانے کی لکھ جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود ان پر گزرے تھے۔

اس عذر سے اگرچہ کسی قدر شاعر کی برأت ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی اس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے۔ بخلاف شاعر کے کہ اس کا اصل مقصود فطرت انسانی کی کرید۔ اور واقعات دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس۔ وہ کسی کے سمجھانے کے لیے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھ کر چیخ اٹھتا ہے۔

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر

درد مند ان کے نہ ان کے درد کے درماں ہیں ہم

پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر

نالہ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اس کے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اس کو واعظ یا ناصح قرار دیکر

۱- خدا تمہ کو شرمائے گویا کہ تیرا ہم میں تو تھا یعنی تو نے ایسے صحیح واقعات پیش کیے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا۔

یہ الزام دینا نہیں چاہیے کہ ”اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم“ بلکہ اس کی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیے کہ ”انہم یقولون مالا یفعلون“

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقض پایا جانا ایک ضروری بات ہے بلکہ اس کے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ ”ولو کان من عند غیر اللہ لوجدو فیہ اختلافا کثیراً“ مگر جس طرح ایک فلسفی یا مؤرخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جاتا اس تصنیف کو عیب لگانا ہے اس طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگانا بلکہ اس کا بیساختہ پن ظاہر کرنا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیے۔ فلسفی یا مؤرخ ہر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے۔ اور اس لیے ضرور ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اس کے سامنے آئے۔ اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اس کے دل کو بے چین کر دے اس کو اسی طرح بیان کرے پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اسی کو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تا کہ اس کو حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے۔ بلکہ جس طرح ایک فوٹو گرافر ایک ہی عمارت کی کبھی روکار کا۔ کبھی پچھیت کا۔ کبھی اس ضلع کا اور کبھی اس ضلع کا جدا جدا نقشہ اتارتا ہے۔ اسی طرح شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی تعریف کرے اور کبھی مذمت۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی تعریف۔ کیونکہ خیر محض کے سوا ہر چیز میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ہر خیر میں خیر کا پہلو موجود ہے۔ عقل، علم، زہد، دولت، عزت اور آبرو عموماً مدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں۔ مگر شعرا نے ان کی جا بجا مذمت کی ہے۔ اسی طرح دیوانگی، نادانی، رندی، فقر، ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں۔ لیکن شعرا ان کے اکثر مداح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس

سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلہ میں اس لیے کہ وہ استاد اور موجد فن تھے اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے۔ اور کبھی اس لیے کہ اس نے ان کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو ان کے پاس نہ تھی اپنے تئیں ان پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دارالغرور و دارالرفن ہے۔ اور کبھی اس کی بڑائی و عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعہ آخرت ہے وہ ایک ہی ررنمنٹ کی کبھی اس کی خوبیوں کے سبب سے ستائش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت مگر وہ کبھی ان حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اس کے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو جو دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ ایک نادان بچہ کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اس کے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھ کر لوگ متعجب ہوں۔ مگر جب تک شاعر کا سادل ان کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا ان کے دماغ میں نہ ہو ان کا تعجب رفع ہونا مشکل ہے۔

”بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را نواگرانِ نخودہ گزند راچہ خبر“

یہ چند اصول جو اوپر بیان کئے گئے ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے۔ کیونکہ جس طرح فوارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اچھلتا ہے۔ اسی طرح نکتہ چینوں کی زبان بند کرنے سے اور زیادہ کھلتی ہے۔ دوسرے نکتہ چینوں سے کان اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ جس طرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا۔ اسی طرح مصنف نکتہ چینوں کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ پس ان کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورت وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچہ میں یہ چند باتیں جنادی جائیں ظاہر ہے کہ سو۔ پلینیشن جس کو شعر و شاعری کا قائل کہا جاتا ہے اس کا پرچھاواں اس ملک پر بھی پڑنے لگا ہے۔ شعر جس کو مدرسہ میں لے جانے کی اجازت نہ تھی اس کو روز بروز زیادہ تر مدرسہ ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پتلے جوق جوق اور فوج فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوق معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شعرا ان کے نزدیک عقل و دانائی سے۔

ان پر شعرا تا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حدی خواں کی آواز اثر کرتی ہے۔ غرض کہ شاعرانہ مذاق یونانیوں یا ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول بیان نہ کرنا ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی۔ اسی لیے مقدمہ میں مطلق شاعری پر کسی قدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اور چند باتیں جو خاص اس مجموعہ سے علاقہ رکھتی تھیں وہ اب دیباچہ میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگر غور کیجئے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار۔ سرے سے شعر کہنے ہی کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

”آنچه مادر کارداریم اکثرے در کار نیست“

مگر مدبر السموات والارض نے اس خرابہ آباد نما کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں الجھے رہیں۔ دھوکے کو حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں۔ اور جس کوشش و جانفشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے بودے اور کمزور جالے کے پورنے میں سرگرم رہتی ہے اسی کوشش و جانفشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور پادر ہوا عمارتیں چنتے رہیں یہاں تک کہ فنا ہو جائیں۔

”درکار خانہ کہ بنائیش بہ غفلت ست ہشیار زیستن نہ ز قانون حکمت ست“

”نروح و نغدو لحاجاتنا و جاجة من عاش لاتقضے

ویسلبه الموت اثوابه و یمنعه الموت ما یشتهی

تموت مع المرء حاجاته و تبقی له حاجة ما بقے“

ترجمہ: ہم اپنے کاموں میں صبح شام سرگرم ہیں۔ اور جو شخص زندہ ہے اس کا کام ختم

نہیں ہو سکتا۔ موت ہی اس کے کپڑے اتروائے گی اور موت ہی اس کی خواہشوں کا خاتمہ

کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اس کے ساتھ ہی مریں گی جب تک وہ زندہ ہے کوئی نہ کوئی

خواہش اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط اک دانا نے
دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط
ہے کوئی؟ جو ہاتھ لگائے
ایک نے جتنے خط تھے بڑے
جب نہ رہا وہاں پیش نظر
دیکھا اٹھا کر آنکھ جدھر
کل کی ہے یاروبات کہ تھی
قوم میں جیسا حال ہے اب
تھے موجود ادیبوں میں
منشیوں میں ایسے تھے بہت
کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
دے یونہی چھوٹے خط کو بڑھا
اٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا
خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
قوم میں باقی جان ذرا
آدمیوں کا کال نہ تھا
انہل و اعشیٰ کے ہمتا
جن پہ کہ نازاں تھی انشا

شعر میں تھے استاد اکثر
لے گئی ان کو آخر کار
اہلِ ہنر کا نام و نشاں
حالی و زید و عمر بنے
اب چاہو استاد گنو
یا ہمیں سمجھو تم کیتا

ہم ہیں وہی ناچیز مگر
كَبْرًا مَوْتُ الْكَبْرًا

شعر کی طرف خطاب

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو، تو غم نہیں
 پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
 صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
 ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
 جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
 تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
 حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
 آپے کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
 تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز
 دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
 وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
 قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کچھ نماز تو
 اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
 جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
 معذور جان ان کو جو ہے چارہ ساز تو
 چپ چاپ اپنے سچ سے کئے جادلوں میں گھر
 اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو
 جو نابلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ
 ر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو
 عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
 محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
 اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
 اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
 کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل
 بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
 ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد
 اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو
 جو قدر داں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
 حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف
 طبعِ رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
 اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
 جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
 اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ
 سر ہے سودا سے تھی، عشق سے دل ہے خالی
 گر غزل لکھے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
 نہ رہی چیز وہ مضمون سوجھانے والی
 آپ بتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
 گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں نکسالی

ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تا کہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہونہ مثل
”قبتہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی“

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں
جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعیِ بلوغ
اس میں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا
اور سخن کی داد ہر پیر و جوان سے لیجیے
اور نہ ہوگر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

بے تمیزی اپناے زمان

از رہِ فخر آ بگینہ سے یہ ہیرے نے کہا
 ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم
 جنس تیری کسمپرس اور قدر و قیمت تیری بیچ
 تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
 دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا
 امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
 مسکرا کر آ بگینہ نے یہ ہیرے سے کہا
 گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
 مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز
 ہیں مبصر ایسے اس بازارِ ناپرساں میں کم
 تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
 تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑ رہتے ہیں ہم

ایک خود پسند امیر زادہ کی تضحیک

کہتے ہیں اک امیر زادہ کو
تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیر زادوں میں
لازمی ہیں وہ اس میں بھی سب تھیں
گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی
آپ تھا خود پسند اور خود ہیں
کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ
علم تیرو کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سنتے سنتے یازوں کی
ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقین

الغرض ایک روز صحرا میں
 جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
 مشقِ تیر افگنی میں تھا مصروف
 کر رہے تھے خوشامدی تحسین
 آ کے دیکھا جواک ظریف نے حال
 وجہ تحسین ہوئی نہ ذہن نشین
 تیر جتنے کمان سے چھوٹے
 پائے سب نے اصول و بے آئیں
 جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا
 تیر آماجگہ کے کوئی قریں
 ایک جاتا تھا چھٹ کے سوئے شمال
 ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے ہمیں
 کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی
 رکھ کے بالائے طاق سب تمکین
 خاک تو دے پہ جا کے ہو بیٹھا
 لوگ کرتے رہے چناں و چینیں

ناوک انداز بولا چلا کر
 کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
 یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے
 یا کہ دو بھر ہے تجھ کو جانِ حزیں
 عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا
 جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
 زد سے ان بے پناہ تیروں کی
 کہیں جاں دار کو امان نہیں
 مجھ کو ہر پھر کے شش جہت میں حضور
 امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

پولٹیکل سپیچیں

اے بزمِ سفیرانِ دُول کے سخن آرا
 ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
 یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن
 کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے
 ظاہر ہے نہ غصہ میں بیاں سے تری زنجش
 نہ لطف میں کچھ طرز بیاں اس سے جدا ہے
 ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار
 اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
 جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں
 اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اس سے سوا ہے

گر سوچئے تو سیکڑوں پہلو ہیں مفر کے
 اور سنئے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے
 دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
 گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانے کیا ہے
 کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
 اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے
 تھے لب پئے اظہار پہ اب آ کے کھلا یہ
 انسان کو اخفا کے لیے نطق ملا ہے

بدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی

نامنصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم
 برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کی رعیت
 جب دورہ کو اٹھتا تھا تو دیہات میں جا کر
 تھا پوچھتا ایک ایک سے ازراہ شرارت
 ہیں پر گنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا
 کرتے ہیں ہماری وہ ستائش کہ مذمت
 تھی اس کی مثال ایسی کہ اک شخص بد آواز
 جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
 گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے
 ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سرعت
 ہوتا کہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری
 آواز خوش آئند و یا قابلِ نفرت

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا ”زینت و اسباب پہ جو لوگ
اتراتے ہیں اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے“
حالی نے کہا ”جن کو ہے اترانے سے نفرت
اترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے“

سید احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں
 بعض کے نزدیک توحید اس کی حدِ تام ہے
 ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول
 جو ہیں قائل اس کے ان پر کفر کا الزام ہے
 کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اس رحمت کو عام
 جس سے غیر از اہل قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
 بعض کہتے ہیں کہ ”شر سے تیرے سب ایمن در ہیں
 بس مسلمانی و دین داری اسی کا نام ہے
 پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عندالغیول
 کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اسے وہ خام ہے

ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ
 اور سب کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے
 بعض کہتے ہیں شعارِ اسلامیوں کا ہے لباس
 جو لباسِ غیر پہنے خارج از اسلام ہے
 بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ
 حصر کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے
 مذہبِ منصور ہے لیکن بیاں کرنا ضرور
 جو مسلم آج کل نزدیکِ خاص و عام ہے
 اہلِ حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
 سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت

قریبِ موسمِ حج، قرض لے کے اک دیں دار
 چلا بہ نیتِ حج، گھر سے سوئے بیت اللہ
 کہا یہ اس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت
 کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ
 کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز
 وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بحالِ تباہ
 نہ نان و نفقہ فرزند و زن سے خاطر جمع
 نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ
 سنا یہ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
 کہ روکتا ہے مسلمان کو حج سے اے گمراہ
 وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
 نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی
 پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے بروبحر کی راہ
 جنہیں فراغت و تنگی میں ہے اسی سے امید
 جنہیں سلامت و آفت میں ہے اسی کی پناہ
 وہ سن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو
 امید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ
 ذلیل ہوتے ہیں جو بن بلائے جاتے ہیں
 طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت و جاہ
 یہ سن کے شیخ نے دیکھا ادھر ادھر کہ کہیں
 ہو مدعی نہ تجسس میں یاں کوئی ہمراہ
 بلا کے پاس پھر آہستہ اس سے فرمایا
 ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ
 قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے
 جوان خام کی واں تک نہیں پہنچتی نگاہ
 خدا کے حکم ہیں مبنی تمام حکمت پر
 فتوح جن میں ہے دنیا و دین کی خاطر خواہ

نماز روزہ ہو یا ہو طواف و عمرہ و حج
 حصول جیسے کہ ہوتا ہے ان سے قرب الہ
 اسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام
 نہ جن میں چاہیے محنت نہ کوششِ جانگاہ
 مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے ورنہ
 ہزاروں پھرتے ہیں حجاجِ سادہ لوح تباہ
 یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
 وگرنہ علمِ معیشت وسیع ہے واللہ

آزادی کی قدر

ایک بندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنہیں
 قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
 ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
 قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہوا اتنی ہے کم
 عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
 بنوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم
 تُعْرِفُ الْأَشْيَاءَ بِالْأَضْدَادِ ہے قولِ حکیم
 دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
 سن کے ایک آزادی نے یہ لاف چپکے سے کہا
 ہے سقر موری کے کیڑے کے لیے باغِ ارم

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں ”آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آ کر کر امت ہے یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہے رکھا قدم
اور کٹکر پانو سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی“
قلبِ ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلبِ ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سید احمد خاں کے اکابر نے یہ پوچھا کہ آپ کس لیے سید سے صاف انحضرتؐ کا نہیں کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھیراتے ہیں آپ ثابت اسلام اس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں آپ بھی (نامِ خدا) ہیں تارکِ صوم و سلوٰۃ اور سلوکِ اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں خود نبوت پر سنے ہیں ہم نے ابراہیم آپ کے اور الوہیت سے جمی دل جمع حضرت کا نہیں چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب و سبغ پھر یہ سید پر تبراً آپ کو زیبا نہیں سن کے فرمایا ”اگر ہو پوچھتے انصاف سے بات یہ ہے سن لو صاحب تم سے کچھ پردہ نہیں رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں بلکہ سارقِ کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

قحطِ اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشمِ پرہم اپنا تھا یا پرایا
”دنیا ساٹھ گئے سب جو تھے مریدِ صادق“
یہ کہنے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اس کو بھی رلایا

نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
 درگزر تھی اور نہ ساتھ ان کے رعایت تھی کہیں
 بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی ان کی معاف
 کام سے مہلت کبھی ملتی نہ تھی ان کے تیس
 حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار
 ذکر کیا نکلے جو پھولے منہ سے اس کے آفریں
 پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اس سے دو چار
 نتھنے پھولے منہ چڑھانا تھے پہ بل ابرو پہ چھیں
 تھی نہ جڑ تنخواہ نوکر کے لیے کوئی فتوح
 آ کے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے اس
 رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
 فرض جس میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعین
 گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
 زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انہیں

حکم ہوتا تھا شرابِ ناپ۔ دکھلاؤ ہمیں
 تاکہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں
 وہاں سوا تنخواہ کے تھا جس کا آقا ذمہ دار
 تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمہ تھیں
 دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
 تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مار آستیں
 ایک دن آقا تھا اک منہ زور گھوڑے پر سوار
 تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ ناز میں
 دفعۃً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
 اور گرا اسوار صدرِ زیں سے بالائے زمیں
 کی بہت کوشش نہ چھوٹی پانو سے لیکن رکاب
 کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آ کر معین
 تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا
 دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعین
 دور ہی سے تھا اسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
 دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے
 اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
 کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم
 زباں جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب
 مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہے
 نہیں جو رائے میں اپنی مذہب
 وہ نیشن کہتے ہیں اس بھیز کو بھی
 کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب
 زباں اس کی نہ ہو مفہوم اس کو
 ہوں آدم تک جدا سب کے جد و آب
 جو واحد لاشریک اس کا خدا ہو
 تو لاکھوں اس کے ہوں معبود اور رب

صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گزرا کہیں میلا کچھلا اک غلام
 اس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اس کو کی
 عرض کی ”ایک اک رواں ہو جس بدن کا ملک غیر
 اختیار اس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی“
 جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
 عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
 کیونکہ جسم آدمی میں پیش اہل معرفت
 کوئی چیز اس کی نہیں سب ہے امانت گور کی

دلی کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالی کے کجاازردِ انصاف کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اس کے سخن کو پسند اہلِ زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا بولے کہ نہیں جانتے تم شعر کے فن کو شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے ہو چھو نہ گنی غیر زباں اس کے وہن کو معلوم ہے حالی کا ہے جو مولد و منشا اردو سے بھلا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو اردو کے وطنی وہ ہیں جو دہلی کے ہیں روڑے پنجاب کو کس اس سے نہ پورب نہ کین و

بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے
 کیا عالم گلشن کی خبر زاعغ و زغن کو
 حالی کی زباں گر بمثل نہرِ لبین ہو
 خالص نہ ہو تو کیجیے کیا لے کے لبین کو
 ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
 پہنچے گا نہ وہ نافہ آہوئے ختن کو
 مانا کہ ہے بے ساختہ پن اس کے بیاں میں
 کیا پھونکئے اس ساختہ بے ساختہ پن کو
 یہ دوست نے حالی کے سنی جبکہ تعلق
 حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو
 کچھ شعر تھے یاد ان کے پڑھے اور یہ پوچھا
 کیوں صاحبِ عزت اسی اردو سے ہے فن کو
 سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے
 کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
 حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
 پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسم عرب
 کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
 سنگ دل باپ اسے گودتے لے کر ماں کی
 گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر
 رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن
 جو کہ اندھے ہیں ہٹے کہ نہیں کچھ ان کو خبر
 لوگ بیٹی کے لیے ڈھونڈتے ہیں جب پیوند
 سب سے اول انہیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر
 ایسے گھر بیابنے بیٹی کو جو ہو آسودہ
 اور مہر سے جو دولت میں ہو افضل تر
 جانے پہچانے ہوں سدا کیا کہنے سارے دن و مرد

ان کے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر
 ایک ہی شہر میں ہوں دونو گھرانے آباد
 دونو نزدیک قرابت میں ہوں باہم دیگر
 جیتے جی مرگئی بس ان کی طرف سے گویا
 جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر
 چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
 پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر
 بد مزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بد چلنی
 کچھ برائی نہیں ذتوں تا ہو داماد اگر
 وہ یہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
 بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر
 جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
 گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنبا دختر
 ساتھ بیٹی کے مگر اب پرو مار بھی
 زندہ درگور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر
 اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
 جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
 برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
 وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
 لیکن نہ اس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی
 اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
 تدبیر یہ بھی اس کی نہ تقدیر سے چلی
 روزی کی خاطر اس نے کیے سیکڑوں جتن
 پر کی کہیں نصیب نے اس کے نہ یاوری
 راہ طلب میں جب ہوئی سرشتگی بہت
 اک خضر پے نختہ نے کی آ کے رہبری

بھگ کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آن کل
 سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیفِ احمدی
 جا اور لفظ لفظ کو اس کے چتھیرا کر
 تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی
 پھر دیکھنا کہ اس وچپ وگرد و پیش سے
 لگتی ہے کیسی آ کے زرو سیم کی جھڑی
 دنیا طلب کو چاہئے ابلہ فریب ہو
 دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابھی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اب خدا پرست
 دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا
 جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں وہو سے
 ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا
 تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست
 جس کا یقین ہے تیرے یقین سے کہیں سوا
 وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر
 گو حاجت اس کی ان سے ہوئی ہے نہ ہو روا
 آتا نہیں یقین میں اس کے کبھی قصور
 امید اس کی روز فزوں ہے اور التجا
 تو بندۂ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے
 وہ ہے کہ یہ ہے بندگی اے بندۂ خدا

استفادہ

لیجیے بھیک دوڑ کر گر ہے گداگری کا یہ
جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے
ہے یہی اصل اکتساب ہو جیسے سب سے مستفید
زک ملے یا سزا ملے درس ملے ادب ملے

لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے

فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول اک حکیم کا ہے "کہ گر غور کیجیے
ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن منید تر
اول تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو
اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب
سو سو طرح سے وہ اسے کرتا ہے جلوہ گر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر

اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بد سگال
 رکھتا ہے جو کہ دوست کے عیب اس سے مستتر
 گو قول ہے متین پہ جو تھی خن کہ تہ
 افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ وہاں نظر
 دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
 عیب ان کے کہ دوست کیوں نہ جتائیں گے بے خطر
 اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب
 وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور
 جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
 موقوف عبرت ان کی نہ دشمن نہ دوست پہ

سخن سازی

ہے مرد سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو
موجود سخن گوہوں جہاں وہاں ہیں طیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طیبوں میں سخن گو
دلوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر پہنچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دلوں

عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں
 اپنے دعووں پہ بیاں کر کے دلیل و برہاں
 کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی
 درد ہیں تیرے اسی واسطے سب بے درماں
 بے غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
 جس کا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں
 سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز
 تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں
 نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
 یہ بھی ہے نیند کوئی موت کا ہے جس پہ گماں

نہ جوانی میں تجھے صبر نہ پیری میں ٹھکیب
 کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں
 کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو
 دیکھ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں
 ہاتھ دھو لذتِ فانی سے نہیں مگر منظور
 عیشِ باقی و حیاتِ ابدی سے حرماں
 نفس نے عقل سے کی عرض کہ اے خضر طریق
 وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجیے جاں
 پر نہیں حکم ترا کوئی عمل کے قابل
 گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیاں
 نقد کو چھوڑنا اور نیسہ کی رکھنی امید
 کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں
 ہے یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا
 سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جس پر قرباں
 ایک اب بھوکے سے کہتا ہے کہ اے قابِ طعام
 ایک مدعو اسے کرتا ہے پس از سالِ رواں

کیونکہ امید پہ اک مائدہٴ نعمت کی
 سال بھر صبر کرے گر سگی میں انساں
 عقل نے سن کے کہا خوف ہے تجھ سے اے نفس
 جُزبہ تیرا تجھے دیکھئے پہنچائے کہاں
 حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں باطل سرسبز
 کیجیے لاکھ بیاں اس پہ دلیل و برہاں
 جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر
 زہر دانستہ کرے نوش نہیں یہ امکاں
 نہ کہیں بھوک میں کھا پیٹھیو یہ لقمہٴ نقد
 اس کے کھانے میں نہیں جان کی خیراے ناداں

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جاے
ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھ سے الگ
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقلِ مراے

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہے رائے
”چاہئے گر رونقِ علمِ زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجئے رکن
جن پہ اس کی سب رکائیں ہیں عیاں“
رائے صاحب ہے بظاہر اور متیں
گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحان
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ
ہے بہت کم برخلاف اس کے گماں

سلطنت کا پر خدا حافظ ہے جب
شاعروں کے ہاتھ ہو اس کی عنان
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے
شعرو انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
ایک پر ان میں سے چل سکتا نہیں
دوسرے کا جادوے حسنِ بیاں
ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی
پھر ترقی شعرو انشا کی کہاں

لوگ کسی کی خوبیاں سن کر اتنے خوش نہیں ہوتے

جتنے کہ اس کے عیب سن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنوں حالی
اس قدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گزار
لوگ جب عیب ہمارا کوئی سن پاتے ہیں
گو کہ کرتے ہیں تأسف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو رنج ان کو کمال
گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار
اور جو ہو گوش زد ان کے کوئی خوبی اپنی
خوش تو پڑتی ہے بنانی انہیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم ان کے
کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زہار
بِسْمِ اللّٰهِ الْحَمْدُ کہ مخلوق کے خوش کرنے کا
نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ طیار

شایستہ لوگوں کا برتاؤ مسائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال
 انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
 مدت تک اس کی جب یہی دیکھی گئی روش
 پوچھا کسی نے اس سے کہ اس کا سبب ہے کیا
 بولا کہ عادت اس لیے کی ہے یہ اختیار
 چھٹ جائے تا کہ مجھ سے یہ لپکا سوال کا
 پہلے جو بھاگو انوں سے ملتی تھی روز بھیک
 آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
 پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار
 منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں نکا

امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت
 گر چند روز اور رہا ان سے سابقہ
 آیا جواب سن کے یہ اس کا بہت پسند
 کی آفریں اور اس سے مخاطب نے یوں کہا
 نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ
 حق میں ترے مفید ہیں یہ ان سے بھی سوا
 انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل
 اہل وطن پہ ان کی مگر جان ہے فدا
 پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ
 دل بھائیوں پہ بھی نہیں ان کا پسیجتا
 انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور
 جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا
 اہل غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ
 شائستگی کا زہر ہے جب سے انہیں چڑھا

اسراف

ایک مسرف نے یہ مسک سے کہا
کب تک اے ناداں یہ جب مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ
ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر
ہنس کے مسک نے کہا اے سادہ لوح
زر لٹا نارائنگاں اور اس قدر
آج ہی گویا (نصیب دشمنان)
آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

پاسِ نیکِ نامی

اے نیک نام شکر کر اللہ کا ادا
جس نے بنایا نیک تجھے کر کے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاسِ تجھے نامِ نیک کا
پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھ کو خوفِ خدا کا ہو اس قدر
جتنا کہ خوفِ طعنہ و تشنیعِ خاص و عام

غرورِ نیکِ نام

گئی ہے حد سے گزر شیخ کی نکو نامی
گمانِ بد کبھی اس کی طرف نہیں جاتا
جو اس کے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی
خود اس کو عیب کا اپنے یقین نہیں آتا

کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
 دوسرا پیدل مگر پہلا سوارِ راہوار
 تھے سول سرجن کی کونھی کی طرف دونو رواں
 کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
 راہ میں دونو کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت
 کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
 صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
 آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
 ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
 چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار

آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونو پیش و پس
 ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
 ڈاکٹر نے آ کے دونو کی سنی جب سرگزشت
 تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
 دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیقِ مرض
 اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
 یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
 کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زہنہار
 اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
 کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
 ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
 آنے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

خودستائی

اے دل بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنوانِ جدا جدا
جو زیورِ خرد سے معرّٰا ہیں ساہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو لوا
کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کبھل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا
کہتا ہے دھرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈب میں میں نے دیا مل جب دکھا

پردہ میں زیر کی کے چھپاتا ہے بخل یہ
 اور بن کے بے وقوف جتاتا ہے وہ سخا
 کچھ اس لیے کہ ہم بھی انہیں میں سے ہوں شمار
 اہل وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
 کچھ اس لیے گڑ اپنا ہو انصاف آشکار
 کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
 کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی
 ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
 کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی
 پرچاتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم برا
 دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ
 اور منہ سے درد کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا
 چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
 یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
 کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہ
 اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا

قانع ہے وہ انھیں پہ ہوئی دھف جو بیاں
 اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
 کہتا ہے زید عمرو ہے شدت سے سادہ لوح
 گنتا ہے سب کو نیک وہ اچھا ہو یا برا
 کہتا ہے عمرو زید بھی کتنا ہے عیب میں
 بد ہو کہ نیک اس کی زباں سے نہیں بچا
 یہ اس کا اور وہ اس کا بیاں کر کے کوئی عیب
 ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا
 غیبت امید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
 ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خود ستا
 حالی جو پترے کھول رہے ہیں جہان کے
 شاید کہ اس سے آپ کا ہو گا یہ مدعا
 یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
 اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا
 القصہ جس کو دیکھے جاہل ہو یا حکیم
 آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مبتلا

حملہٴ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے
گر کبھی حملہ پہ اس کے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اس کے ٹھیراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زورِ بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

جس قوم میں افلاس ہو اُس میں بخل اتنا بد نما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو سرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخور
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کمتر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لیے ہے یہ بیاں موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت

وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تو نگر
پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

رؤسائے عہد کی فیاضی

کی رئیسِ شہر کی تعریف یاروں نے بہت
 برسبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اس کا چلا
 بولے آج اس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر
 عاملانِ شہر مدعو اس کے رہتے ہیں سدا
 ضلع کے حکام کا اونٹی اشارہ چاہیے
 پھر کوئی دیکھے سخاوت اس کی اور بذل و عطا
 یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی بنیں
 ان میں صرف اس کی رقم ہے سب کے چندے سے سوا
 پاکی یا ویکٹ ہے جو سواری اس کے پاس
 لہکاروں کے لیے ہے وقف بے چون و چرا

کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس
اس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رُووریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ ان سے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں
سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

ایمان کی تعریف

فقیرِ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف
تو دی چراغ سے اس کو بآب و تاب مثال
کہا فتیلہ اقرار باللساں ہے ضرور
جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال
کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل
نہیں ضرور فتیلہ کا جس میں استعمال

برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزادہ کہ ہے جن میں ملاپ
 دولت و بخت ہے ہر حال میں ان کے ہمراہ
 نہ انہیں حاجتِ اموال نہ تلاشِ انصار
 نہ انہیں خوفِ بد اندیش نہ بیمِ بدخواہ
 پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یکجہتی
 اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ
 نہ ملاز ان کے لیے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
 نہ مفید ان کے لیے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
 ایک ملانے سنا جب یہ سخن فرمایا
 تکیہ اور اس قدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ

اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
 دست قدرت کے ہے سب ہاتھ سفید اور سیاہ
 و اں نہ ملت کی ضرورت ہے نہ کچھ پھوٹ کا ڈر
 پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
 کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر
 کر دیں افراد پراگندہ جماعت کو تباہ
 پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم
 اس کو جب دیکھا ہے دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

بُعدِ صوری مانعِ قربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیے شہر میں اک گھر
 جا اپنے محلّہ سے کہیں دور بنایا
 جب اہل محلّہ سے چلا ہو کے وہ رخصت
 دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا
 ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس
 اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
 بلی کہ جو بے عقل ہے دم دیتی ہے گھر پر
 اتنی بھی محبت تمہیں گھر سے نہیں آیا
 حالی نے کہا انس ہے چیز اور وفا اور
 بلی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا

اس مہر و وفا کی نہیں بلی پہ پڑی چھینٹ
کتے نے ہے جس کا کہ سبق ہم کو پڑھایا
ہم غش ہیں مینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی
گھر بھول گئے ہم تو نہیں تم کو بھلایا
گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

ناصحِ مخلص اور اہلِ غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفرِ صادق سے عرض کی
محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور
فرمایا ”ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرفِ نصیحت زبان پر
اور جن سے ہے امیدِ نصیحت وہ بالیقین
صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری حذر“

خادم آقا کی خدمت میں کیوں

گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدام ماموں کے بہت گستاخ تھے

ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا

کوئی آقا جب کہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت

پیش خدمت اس کے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا

پر جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم

ہے دلیل اس کی کہ ہے خود خلق آقا کا برا

کھو دیا ہیبت کو اپنی جس نے اور تمکین کو

اس نے گویا ڈھا دیا رکنِ رکیں اخلاق کا

خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکل کا تیر چڑیا پر
 ہو گیا اتفاق سے جو خطا
 ابنِ حمدوں ندیم تھا حاضر
 کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
 ”جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہے
 خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
 جانہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ
 تو نے دی قصداً اس کی جان بچا“
 ابنِ حمدوں نے کی یہ دانائی
 کہ خوشامد سے یوں اسے تھپکا

دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے
ہو کے اپنی خطا سے کھیانا
جائے کنجشک ابنِ حمدوں پر
تیر کا اپنے امتحاں کرنا
ابنِ حمدوں کی جان گو جاتی
دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

رعیت پر نا اہل کو مسلط کرنا

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اس کے
 ”فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
 وہ خطہ ملعون تھا یہی جس کی بدولت
 تھا دل میں خدائی کا خیال اس کے سمایا
 میں بھی اسے اس باغی طاغی کے علی الرغم
 اک بندہ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
 کہتے ہیں حسیب ایک غلام حبشی تھا
 جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
 کی سلطنتِ مصر کی باگ اس کے حوالے
 نا اہل کے نیچے میں اہالی کو پھنسایا

باڑی گئی بہ ایک برس نیل کی رو میں
 یہ حادثہ آ اسکو کسانوں نے سنایا
 فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اون
 ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا
 ہارون نے سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی
 محکوم ہے جو میری رعایا و برایا
 فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا
 اپنے کو خدا جس نے ہے عالم کو بنایا
 جوکھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی
 اک سفلہ ناکس کی بنا اس کو رعایا

رشک

ظاہر مردوں کی طینت میں نہیں رشک اس قدر
 ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں
 ایک شہزادی کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
 تختِ شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشین
 سلطنت میں اس کی تھا مردوں کو کلی اختیار
 عورتیں اصلاً ذلیل اس کی حکومت میں نہ تھیں
 مرد ہی تھے اس کے محرم مرد ہی اس کے مشیر
 تھا نہ عورت کا پتا دربار میں اس کے کہیں
 تخیلہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
 ہنس کے فرمایا کہ اے دولت کے ارکانِ رکیں

مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں
بلکہ ہے انس اس لیے تم سے کہ تم عورت نہیں
بات کی حسنِ بیاں سے اس نے دی صورت بدل
تا کہ کوئی سوءِ ظن اس پر نہ کر بیٹھے کہیں
ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اس لیے نفرت کہ ہے مردوں کی صورت دل نشیں

قانون

کہتے ہیں ہر فرد انساں پر ہے فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا
اس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا
پر اسے دیتے ہیں توڑاک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کم زوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زور مندوں کی ہے لا

شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو
تختِ پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ ان مقصودوں نے
عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اس کی قبل از بلوغ شادی
کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک ان کے گویا برغم عقل و دانش
ہے کنگڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

حرص

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلامِ واعظ
قدرِ قلیل ہے سب مال و منالِ دنیا
گویا کہ حرص اس کی اس سے بچھی نہیں ہے
ہے جس قدر فراہم پاس اس کے مالِ دنیا

أمر اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خردمند
وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت
پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں
ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت
بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبا
بیمار کو کچھ اس سے سوا ان کی ہے حاجت

عصمت بی بی از بے چادری

اے بیواؤ ہنتے ہو کیا منعموں پہ تم
 اخلاق میں کچھ ان کے اگر آ گیا بگاڑ
 تم زد سے نفس کی ہو جسمی تک بچے ہوئے
 ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے مفلسی کی آڑ
 اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش
 گر تم کو ہوں نصیب تو دنیا کو دو اجاڑ

سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے
 دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
 سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
 سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

ٹھوٹ کارِ یگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ باز پرس
اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آ آ کے جو لوگ
تمہاری ہر دم اے اربابِ دولت
خوشامد پر نہ ان کی بھولنا تم
وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہم نے بیاں کیں خصلتیں نیک
نہیں ان میں سے تم میں ایک خصلت

تدبیرِ قیامِ سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
 و ماں پانو جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
 اور عقلِ خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
 یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
 پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
 مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
 کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
 جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی بری گت لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج وہاں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار قبضہ میں ہے وہاں عورتوں کے دولت و مکنیت اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی سمجھو کہ ہے اس ملک میں مردوں کی حکومت

مغرور کی پہچان

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو
تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار
جنہوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا
بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زہد

کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

گدائے مبرم

اک برہمن مورتی کے سامنے باصد نیاز
 مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں
 آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا ادھر
 دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں
 جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے
 تا کہ پوجے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شریک
 مورتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا
 بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ ہیں
 مورتی کچھ تجھ کو دے گی اور نہ دے سکتی ہے وہ
 ناحق اتنی التجائیں اس کے آگے تو نے کیں
 ہنس کے برہمن نے کہا ہے مانگنا بندہ کا کام
 دے نہ دے وہ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں
 ہم نہیں دیتے ڈھٹی تم جیسے ڈھیوں کی طرح
 ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پانو پھیلاتے نہیں

بے اعتدالی

تم لے خود پرستو طبیعت کے بندو
 ذرا صف اپنے سنو کان دھر کے
 نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
 جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس لہر کے
 جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
 تو چیخ اٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
 جو بحرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جب تک
 کاٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
 اگر ہل پڑے چہرہ گنجفہ پر
 تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے

پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو
 کہ بس ٹھن گئے عزمِ جنگِ تتر کے
 چڑھا بھوتِ عشق و جوانی کا سر پر
 تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
 جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو
 کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے
 جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی
 رہیں پانو کے ہوش جس میں نہ سر کے
 جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت
 غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

طیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمہ سے ہوتا ہے ہر بشر کو ملال
کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے
تو اور بھی اسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہے کہ ہوتے نہیں طیب ملول
جو چل بے کوئی ان کے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ تھپ جائے گی خطا ہم پر
کیا ملال کا اپنے گر اس جگہ اظہار

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی
پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اس سے کارِ نمایاں کوئی اگر
کرتا ہے بار بار بیاں اس کو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہئے
ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اک جدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اس کو یاد
یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد پہ انساں کو چاہئے
آخر بشر کا خاصہ ہے سہو اور خطا

فضولِ خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف
 جہاں سے ہو کے گزرتے تھے سب صغیر و کبیر
 ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش
 نخی ہو اس میں کہ مسک 'غریب ہو کہ امیر
 فضولِ خرچ تھا بستی میں ایک دولت مند
 کہ جس کا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
 ہوا جو ایک دن اس راہ سے گزر اس کا
 درم اک اس نے بھی چاہا کہ کیجے نذرِ فقیر
 کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت
 کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر

پہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار
کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اللے تلے رہے تو آپ کو بھی
ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہے یہی لینے کا خود بدولت سے
دکھائے دیکھیے پھر اس کے بعد کیا تقدیر

اختلافِ مذہبِ رفع نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اٹھ جائے دلیل و بحث سے
جو چلا آتا ہے باہم اہلِ مذہب میں خلاف
مہو نہیں سکتا مطابق جبکہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیونکر ہزاروں اختلاف

انسان جو اشرف المخلوقات ہے

سب سے زیادہ موردِ آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
 دو ہیں ان میں سے نہایت جانگزا
 ایک فکر اس آنے والے وقت کی
 شک نہیں ہے جس کے آنے میں ذرا
 دوسرے چوٹیں زبانِ خلق کی
 زخم جن کا زخم ہے تلوار کا
 اور بھی حیوانِ ناطق کے لیے
 ہیں بہت سی زحمتیں ان کے سوا
 پر گدھے اور اور حیوانات سب
 رہتے ہیں دور ان گزندوں سے سدا
 کیسا ان آلام سے رہتا نچنت
 اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

چنڈ و بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈ و کدو تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ اس کام کا آخر انجام
بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو دواع اور جوانی کو سلام
آنکھ میں اپنے پرانے کی ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام
جس سے عقبنی ہو درست ایسا نہ ہونا کوئی بیج
جس سے دنیا میں ہونا ایسا نہ کرنا کوئی کام
ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا
نفسِ سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر
 لے نہ اس زہرِ ہلاہل کا کوئی بھول کے نام
 یہ تو کہتے ہو کہ انجام برا ہے لیکن
 یہ بتاؤ کہ برا ہوتا ہے کیسا انجام
 برے انجام کی تب ہوگی حقیقت روشن
 برے انجام سے جب آ کے پڑے گا خود کام
 مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
 گو نہ رکھتے ہیں یقین موت کا سب پختہ و خام

قوم کی پاسداری

اک مسلمان خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
 پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
 چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہل ملک کو
 گو کہ ان کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
 کارخانہ کا یہ راجس کے کبھی چاکو نہ لیں
 اس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
 خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انہیں
 ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
 الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
 جانتے ہیں دین و ایماں اپنا قصہ مختصر
 سن کے حالی نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا
 ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر

ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبعِ بشر
کھیاں جیتی نکل جاتے ہیں پاسِ قوم میں
اچھے اچھے راست باز اور حق پسند اور دادگر
ہاں بری اس عیب سے لے دے کے اس دنیا میں ہے
چشمِ بددور امتِ مرحوم اے جانِ پدر
اور قوموں سے انہیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہو گا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یاں
جس قدر ہے ان سے اپنوں اور یگانوں کو خطر

غزلیاتِ قدیم و جدید



قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہو گا حق کیونکر ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا

چچتا نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

قطعہ

عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی یاں
ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بے خود
جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

طاعت میں لب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھ کر
عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگِ بیاںِ حالی ہے سب سے جدا تیرا



کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا

کاوش میں ہے الہی دگدا میں ہے طبعی
جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا

چھوٹے ہوئے ہیں گوجی پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جاں تیرا

ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

ہے پور زال سے دل اس کا قوی زیادہ
رکتی ہے آسرا یاں جو پیرِ زال تیرا

ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی
یا رب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگِ آشنائی
سن سن کے سرد نہیں گے قال الملّٰی حال تیرا



رَبُّز میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
 نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشے میں خمار دیکھا

نہ جی رکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
 رہے سدا نامراد جو یاں انہیں بھی امیدوار دیکھا

رخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں
 نہ بلبل و گل میں وہاں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا

سوارِ محمل کی جستجو میں ہزاروں دشتِ طلب میں دوڑے
 نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اٹھتا غبار دیکھا

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
 ملا نہ کھوج اس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا

لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھکے دریائے پر خطر سے
 گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا

بچے ہوئے کا ہشوں سے یاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا

چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گل ان کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہے، کیسا ہے، کون ہے اور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اک استوار دیکھا

سلوک میں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلمان
نہ ان سے کچھ تیرا بیر پایا نہ ان سے کچھ تیرا پیار دیکھا

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیئے ہاتھ باندھ سب کے
جنھیں تھایاں اختیار سب کچھ انھیں بھی بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بے کار تجھ کو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا



پردہ ہو لاکھ کینہ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا

مضمون ہے نقشِ دل میں لَدَيْنَا مَزِيدُ كَا
کونین سے بھرے گانہ دامن امید کا

قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

دیکھا ہے ہم نے عالمِ رحمت کو غور سے
ہے شش جہت میں قحطِ دلِ ناامید کا

شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں
انجام ایک ہو گا شقی و سعید کا

ہے نزدبانِ جذبہ توفیق درمیاں
یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا

ہے آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ
خون جگر میں نشہ ہے جامِ نبید کا

تسکین نہیں مشاہدہ گاہ گاہ سے
یا رب یہ روزہ دار ہے مشتاقِ عید کا

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر
لَا تَقْنَطُوا جَوَابَ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیابیاں
لے گا نہ کوئی نامِ ظہیر و رشید کا

نعت

یا ملکی الصفات یا بشری القوی
فیک دلیل علی انک خیر الوری

تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ باراں سے خاک
خَلَقْكَ خَصْبُ الزَّمانِ بَعَثَكَ مَحْيَا الْوَرَى

دعویٰ روشن ترا ثابتِ بے بپنہ
صورت و سیرت تری صدق پہ تیرا گوا

قال ترا اور حال نشہ وحدت میں چور
اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

غیب سے بھیجا تجھے ٹاپتا پھرتا تھا جب
دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما

اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت
جیسے کہ ہنگامِ قحط قبلہ سے اٹھے گھٹا

شان رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں
گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا

گلہ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو
گلہ آدم تجھے سوپ چکی تھی قضا

دوڑ پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں
امیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا

راہب و قسیس و حیرہ گئے دل تھام کر
دیکھ کے تیرا قدم ہم قدم انبیا

خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شر و فساد
تو نے اسی کو دیا ارضِ مقدس بنا

تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب
جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحم کیا

چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت
تو نے کیا دام دام قرض سب ان کا ادا

تو نے کیا سرتق عارف و عامی پہ فاش
ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا

چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی
ایک کے چرکا لگا ایک کو گھائل کیا

حجتِ حق کر چکا دین ترا جب تمام
پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما

دیر ہوئے بے چراغ اور صلواتِ یہود
شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا

بجھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بت کدے
ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا

اٹھے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھانس
مربلہ پر چند روز پاتی ہے نشوونما

غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام
مل گئے اٹھ اٹھ کے سب خاک میں اہل ہوا

رہ گیا نامِ سجاحِ کذب میں ضربُ المثل
اسود و ابنِ کثیرِ خوار ہوئے بر ملا

سلسلہٴ انبیاءِ ختم نہ ہوتا اگر
حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اٹھا

آتے ہی چشمہ دیا تو نے کوئیں سے نکال
جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا

بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ
بھیج چکا تیرے ہاتھ ملتِ بیضا خدا

تجھ پہ صلوة و سلامِ ربِّ سموات سے
روز و شب و صبح و شام قدرِ مال و دھن



اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

ابرا رتجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا

رایوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا

جس رہگذر میں بیٹھا تو غول راہ بن کر
صنعاں سے راست رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا

فرہاد کو بہن کی لی تو نے جان شیریں
اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوب سے بشر کو دی تو نے ماصبوری
یوسف سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ دونو ہیں دل گداز تیرے
پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رلا کے چھوڑا

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چیقلش جہاں کی
عقل و خرد کا تو نے خاکا اڑا کے چھوڑا

علم و ادب رہے ہیں دل بے ترے ہمیشہ
ہر معرکہ میں تو نے ان کو دلا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداو تیری دلکش
شعرو سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چمکا لگا کے چھوڑا



دیکھ اے امید کچھ ہم سے نہ تو کنار
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

مے خانہ کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا
مدت کے بعد کل وہاں جانکے تھے قضارا

اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے
اے زاہدو تمہارا ہے اس میں کیا اجارا

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اول
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

توفیق نے ہمیشہ لی سنت پر خبر یاں
جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کناراً

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہنرتے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا
خود کام و خود نما ہیں خود میں ہیں اور خود آرا

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اس کے کیا کام
اچھا ہے یا برا ہے پھر یار ہے ہمارا



رونا نہ ہو گا حالی شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

الفت میں دم بدم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی
چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا

عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ
ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمہارا

دلجو نہیں کوئی یاں حیف اے صنم پرستو
دلکش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمہارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہو گا گر وزن کم تمہارا

دشت طلب کے رستو طے ہو گے کس طرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمہارا

دو بیواؤں کو بھی کچھ جم کے جانشینو
 بس جامِ جم ہمارا اور ملکِ جم تمہارا
 روسی ہوں یا تاری ہم کو ستائیں گے کیا
 دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثہ ہماری
 احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیئے سوارو
 ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
 گزرا ابھی ہے یاں سے خیل و حشم تمہارا

پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم
 گم ہے تمہیں میں یارو باغِ ارم تمہارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
 کچھ کر کے بھی دکھائے زورِ قلم تمہارا



وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خود مہر وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلی سے نکلتے ہی ہوا چینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یا رب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونو نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں
چھل بل میں تم اس زال فسوں گر کی نہ آنا

افسوس کہ غفلت میں کٹا عہدِ جوانی
تھا آبِ بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا

دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانہ

ڈھارس سی کچھائے ہم قدمو تم سے بندگی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا



جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجیے گا

سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعویٰ
یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

اسی میں ہے خیرِ حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
 زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضدِ بے کمالی نہیں ملاپ ان میں حرف گرو
 جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زہد نہ دردِ الفت کی آگ زہد
 پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا

تمہارا تھا دوست دارِ حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو
 سلوک اس سے کیے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجیے گا



ہو عزمِ دیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا
آتا ہے دور ہی سے ہم کو نظر گھر اپنا

قیدِ خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم
وحشت رہے گی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیرِ مغاں سے ہو کر تب سرخرو ملیں گے
فضل و ہنر کا ہو گا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ و شہ ہے گروہ تو ہے ہمارے ڈھب کا
ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی
گر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محض اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

غیروں کو لیس گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مگر اپنا



معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے بانگِ طبلِ شاہی دن ہو گیا جب آخر
خوابِ گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کس کو
اے عندلیبِ نالاں یہ تو نے گل کھلایا

ویراں ہے باغِ تسپر پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے پا رب بلبیل کو کیا سنایا

اے عشقِ دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی سزا سے
احسان اس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا

واعظ کی محبتوں سے قائل تو ہو گئے ہم
کوئی جوابِ شافی پر اس سے بن نہ آیا

آیا نہ تھا کبھی یاں گویا قدم خزاں کا
دودن میں یوں پلٹ دی کس نے چمن کی کایا

تقلیدِ قوم ہی پر گر ہے مدارِ تحسین
تو ہم نے دوستوں کی تحسین سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی چچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہم کو ان کا نشان نہ پایا



نفسِ دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اترے جی سے دل اکثرِ یبا کرتا رہا

حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کھتا رہا

چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی
چپکے چپکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا

طاہنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا رہا خطا
وار ان کا اس لیے اکثر خطا کرتا رہا

نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی
اس کو چلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا

منہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں
ان سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

تھا نہ استحقاقِ تحسین پر سنی تحسین سدا
حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ لہا کرتا رہا

شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں
کبرِ نفس اتنا ہی یاں نشوونما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا



کہیں الہام منوانا پڑے گا
کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا

جنہیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا
انہیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

عوام الناس کا ہو گا جنہیں مونہہ
انہیں خاصوں پہ مونہہ آنا پڑے گا

رہے وصفِ جناں کی مشقِ واعظ
تمہیں بچوں کو پھسلانا پڑے گا
خُن میں پیروی کی گر سلف کی
انہیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

قطعہ

تعلق کا ہے پھندا بیچ در بیچ
یہ عقدہ ہم کو سلجھانا پڑے گا
بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے
بس اب دنیا کو ٹھکراتا پڑے گا
نہیں بو اُنس کی اس غم کدے میں
کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا
دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے
ہمیں یاروں سے شرماتا پڑے گا

زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند

وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا

جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید

ارادہ فتح فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک

اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا



خن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی
تہہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا

رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی
بس اب دل سے شکوؤں کو دھونا پڑے گا

بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن
جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا



کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا
مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا

پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں
جو لگائے گا تجھے پچتائے گا

دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام
آج اگر آیا نہیں کل آئے گا

ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد
اک یہ لپکا دیکھتے کب جائے گا

واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے
پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت
اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم
ہم پہ مونیہ آئے گا مونیہ کی کھائے گا

دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف
رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل
جی نفس میں اس کا کیا گھبرائے گا

رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا
شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا

ابر و برق آئے ہیں دونو ساتھ ساتھ
دیکھیے بر سے گا یا برسائے گا

مشکلوں کی جس کو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا



وہاں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
مونہہ اسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں ہے باقی وہی حرصِ گناہ
پھر کیے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا

آؤ لیں اس کو ہمیں جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے انس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جاننا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھئے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا



کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اس نے تو اللہ سے غافل ناصح
اس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چاپ تے اسوے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے نا
چھوٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دنیا
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگرے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنویا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سما یا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا



راحت کا جہاں میں یونہی اک نام ہے گویا
راحت کی تلاش اک طبعِ خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دنیا میں نکو نام ہے گویا

ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام ہیں ان کا یہی انعام ہے گویا

سچت رحیل اور وہی عشرت کے ہیں سلاں
آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا

اٹھا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بری طرح
آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا

ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

جب دیکھیے حالی کو پڑا پائیے بیکار
کرنا اسے باقی یہی اک کام ہے گویا

ق

خلوت میں تری صوفی گر نور صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفت جاں اس کا انداز کمانداری
ہم پنج کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سنا قاصد
ان پڑھ تو ہے تو یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا

باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے الفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا

ہم روزِ وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحبِ دل ہوتے سن کر مری بے تابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے درگذرے وہ چاہے سو کر گذرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانے کیا ہوتا

کل حالیِ دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا



پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشان نہ تھا
تھا حُسنِ میزبان، کوئی میہماں نہ تھا

ہم کو بہار میں بھی سرِ گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دلِ شاداں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیمِ جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازکِ عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغِ کہ وہ مہرباں نہ تھا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیبِ دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زیہ نہار
شبِ انجمن میں حالیِ جاد و بیاں نہ تھا



رنج اور رنج بھی تنہائی کا

وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا

کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا

کس کو دعویٰ ہے ہکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم

شوق تھا بادیہ پیمائی کا

اس سے نادان ہی بن کر ملیے
کچھ آجارہ نہیں دانائی کا

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

درمیاں پائے نظر ہے جب تک
ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل
مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں
گل و بلبل کی شناسائی کا

مدد اے جذبہ توفیق کہ یاں
ہو چکا کام توانائی کا

مقتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا



اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگِ طور تھا

دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

دردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال
ایک ایک رند نشہ وحدت میں چور تھا

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاصِ محرمِ بزمِ حضور تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر
بہرِ نمازِ نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شاد ماں
تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا



دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دلِ رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا

دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے مونہہ میں موت کے جایا نہ جائے گا

مے تند و ظرفِ حوصلہ اہلِ بزمِ تنگ
ساتی سے جامِ بھر کے پلایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کو دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ طنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصرِ غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہلِ دین کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا



قلق اور دل میں سوا ہو گیا

دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل

اگر تیرا اس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور

مرا شکر اس کا گلا ہو گیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا

وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کارہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

نہ دے میری امید مجھ کو جواب
رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

نپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل جتلا ہو گیا



سنگِ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا
اب دیکھنا ہے زورِ دلِ بے قرار کا

اک خُوسی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبارِ زندگیِ مستعار کا

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
مٹتا نہیں محلِ گلہ روزگار کا

سمجھو مجھے اگر تمہیں ہے آدمی کی قدر

میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا

گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدہ وصال

سن لیں گے وہ مآل شبِ انتظار کا

اب محو بوائے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں

ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

ہر سمت گردِ ناقہ لیلیٰ بلند ہے

پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا

خانہ خرابِ خاطرِ الفت شعار کا

حالی بس اب یقیں ہے کدلی کے ہوز ہے

ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

ب

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب

کیمیا کو طلا سے کیا مطلب

چشمہِ زندگی ہے ذکرِ جمیل

خضرو آبِ بقا سے کیا مطلب

بادشاہی ہے نفس کی تسخیر

ظلِ بالِ ہما سے کیا مطلب

جو کریں گے بھریں گے خود واعظ

تم کو میری خطا سے کیا مطلب

جن کے معبود حور و غلاماں ہیں
ان کو زاہدِ خدا سے کیا مطلب

قطعہ

کام ہے مردی سے انساں کی
زہد یا اتقا سے کیا مطلب

ہے اگر رند دامنِ آلودہ
ہم کو چون و چرا سے کیا مطلب

صوفی شہرِ با صفا ہے اگر
ہو ہماری بلا سے کیا مطلب

نگہتِ رے پہ غش ہیں جو حالی
ان کو درد و صفا سے کیا مطلب



مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی مونہہ میں زباں ہے اب

وہ دن گئے کہ حوصلہِ ضبطِ راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

جس دل کو قیدِ ہستی دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقہِ زلفِ بتاں ہے اب

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

لفزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمنِ دین مہرباں ہے اب

اک جرءِ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانہ پیرِ مغاں ہے اب

ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب

ہے دلِ غمِ جہاں سے سبکدوش ان دنوں
سر پڑتا سوجھتا کوئی بارگراں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ سے فروش
وہ علم و دین کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

پ

یہ ہیں واعظ سب پہ مونہہ آتے ہیں آپ
 ناصح قوم اس پہ کہلاتے ہیں آپ

بس بہت طعن و ملامت کر چکے
 کیوں زباں رندوں کی کھلواتے ہیں آپ

ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو
 چڑھ کے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ

واعظو ہے ان کو شرمانا گناہ
 جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں ایک اک کی تکفیر آپ کیوں؟
 اس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ
 کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
 خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ
 چھینر کر واعظ کو حالی خلد سے
 بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

ت

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

زیر برقع تو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

ہٹ پہ اس کی اور پس جاتے ہیں دل
راں ہے کچھ اس کو خودرائی بہت

سرو یا گل آنکھ میں جتے نہیں
دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت

چور تھا زخموں میں اور کہتا تھا خر
راحت اس تکلیف میں پائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
 دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
 وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
 مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
 جاں نثاری پر وہ بول اٹھے مری
 ہیں فدائی کم تماشائی بہت
 ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
 خاکساری اپنی کام آئی بہت
 کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
 تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
 گھٹ گئیں خود تمنخیاں ایام کی
 یا گئی کچھ بڑھ کھیبائی بہت
 ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
 راست گوئی میں ہے رسوائی بہت



اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
 نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
 کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غم روز جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
 ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
 اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخِ مصور سے کھچے یا نہ کھچے
 صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
 یہ ڈر لیا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسہ زر کی صورت

میں بچا تیرِ حواث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرنے تسلیم سپر کی صورت

شوق میں اس کے مزاج میں اس کے لذت
نامو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ نریت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

مرہماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسانِ خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرنی ہے بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حلی بھی بلا تے ہیں گمراہی مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گمراہی صورت



بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
پہ چھپتی نہیں سرگرائی کی صورت

جسے دیکھ کر دل ہو عاشق کا بے گل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شبِ وعدہ ہے بارِ عام ان کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غمِ دل نے رسوا کیا ہم کو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہے اس ریش پر دمہ کیا خوب کھلا
ذرا دیکھنا شیخ فانی کی صورت

یقین ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

ٹ

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

رج رہی ہے کان میں یاں لے وہی
اور معنی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہ گئی
راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اچاٹ

جو کہے تجھ کو بنا دیں اے امیر
ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ

ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
مڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

تنغ میں برش یہ اے حالی نہیں
جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

ش

باپ کا ہے جیہی پسر وارث
ہو ہنر کا بھی اس کے گر وارث

گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا
تیرا ہے کون اے ہنر وارث

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی
لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث

ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ
کریں میراث سے حذر وارث

خاک و کرمانِ گور و خویش و تبار
ایک میت اور اس قدر وارث

واعظو دین کا خدا حافظ
انبیاء کے ہو تم اگر وارث

قوم بے پر ہے دین بے کس ہے
گئے اسلام کے کدھر وارث

ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف
جیسے مردہ کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث



بہید واعظ اپنا کھلوا یا عبث
دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث
جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی
رات بھر یاروں کو چھوایا عبث
شیخ! رندوں میں بھی ہیں کچھ پاک باز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث
کوئی پنچھی آ کے اب پھنتا نہیں
آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

کھیتیاں جل کر ہوئیں یاروں کی خاک
ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

قوم کا حالی چہنا ہے محال
تم نے رو رو سب کو رلوایا عبث

ج

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج
بول کر ہم نے مونہہ کی کھائی آج

چپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ
بات بگڑی بنی بنائی آج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

بزم ساقی نے دی الٹ ساری
خوب بھر بھر کے خم لٹھائی آج

قطعہ

معصیت پر ہے دیر سے یارب
نفس اور شرع میں لڑائی آج

غالب آتا ہے نفسِ دُوں یا شرع
دیکھنی ہے تری خدائی آج

چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کر لو کربنی ہے جو کمائی آج

زود سے الفت کی بیج کے چلنا تھا
مفت حالی نے چوٹ کھائی آج



تلخیِ دوراں کے ہیں سب شکوہِ سنج
یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج

رنج و شادی یاں کے ہیں سب بے ثبات
اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

تھا قناعت میں نہاں گنجِ فراغ
پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج

فکروں بڑھتے ہیں شاید ساتھ ساتھ
ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج

ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا
جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج

آگنی مرگِ طبیعی ہم کو یاد
شلاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج

راہ اب سیدمی ہے جالی سوائے دست
ہو چکے طے سب خم و چوچ و ہلکنج

ہج

بزمِ اچھی ہے گو دنیا ہے اے مے خوار ہج
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھریار ہج

نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن بر سر کیس ہو تو ہیں سب یار ہج

شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دکان اور رونقِ بازار ہج

شاہدِ معنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
سجہ و سجادہ ہج اور جبہ و دستار ہج

ہو گر جتے جس قدر اتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو! ہے یہ سب گفتارِ بے کردار ہیچ

روئی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پیجا دل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب اے چشمِ گوہر بار ہیچ

خوانِ نعمت نے ترے اے عاملِ مردارِ خوار
کردیے آفاق کے سب خوانِ دخواں سالار ہیچ

ہے ادبِ مسند پہ جو کچھ ہے رئیسِ شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دوچار ہیچ

ح

کاٹھے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکن پاسبانوں کی طرح

منزلِ دنیا میں ہیں پادِ رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلنے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپ سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکتے ہیں تمکلیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو
ہیں اسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

ان کے غصے میں ہے سوزی سلامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے ان کو گو ہو عالم نکتہ چینی
رہتے ہیں بتیس دانوں میں زبانوں کی طرح

طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سپانوں کی طرح

کبھے کیا حالی نہ کبھے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

خ

مے مغاں کا ہے چسکا اگر برا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ

ریا کو صدق سے ہے جامِ مے بدل دیتا
تمہیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ

وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ

غرورِ فقر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ

زباں پہ ہوتی ہے مہراں کی جو ہیں محرم راز
پھر ایسا کچھ ہرگز نہ ادعا اے شیخ

خبر بھی ہے تمہیں؟ کیا بن رہی ہے بیڑے پر
ہیں آپ جون سے بیڑے کے ناخدا اے شیخ

وہ ڈوبتوں سے الگ رہتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا یہی گر ہے مرجبا اے شیخ

گوزن و گور ہیں بچپن سے تارکِ دنیا
نہایت آپ کی ہے ان کی ابتدا اے شیخ

کمالِ حسنِ عقیدت سے آیا تھا حالی
پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

و

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محاسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

گر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصحِ خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامتِ خطا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنامِ شہرِ شہر
بارے ہوئی قبولِ بہت التجا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگرِ خراش
دلکش صداسنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد



کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد

تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد

درگزر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے

تو ترا اور کوئی ہو گا خدا اے زاہد

ہم دکھا دیں گے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور

کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

قربِ حق کے لیے کچھ سوزِ نہاں بھی ہے ضرور

خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے
تو ہی کہہ اس میں ہے کیا میری خطا اے زاہد

جال جب تک ہے یہ پھیلا ہوا دینداری کا
فکر دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج کیے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد

ذ

پیاس تیری بوئے ساغر سے لذیذ
بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ

جس کا تو قاتل ہو پھر اس کے لیے
کون سی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب
ہم کو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ

قد سے شیریں تری پہلی نگاہ
دوسری قدرِ مکرر سے لذیذ

جھانجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو

بھوک ہے وہ شیرِ مادر سے لذیذ

ہے یہ تجھ میں کس کی بُو باس اے صبا

بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ

جو قناعت کے ہیں حالی میہماں

ان کو فاتے ہیں مزعفر سے لذیذ

۱

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر

وہی اصرار ہے خطاؤں پر

رہیں نا آشنا زمانہ سے

حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر

رہو و باخبر رہو کہ گماں

رہزنی کا ہے رہنماؤں پر

ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا

مرتے ہیں ہم انہیں اداؤں پر

اس کے کوچہ میں ہیں وہ بے پروبال
اڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر

شہسواروں پہ بند ہے جو زاہ
وقف ہے یاں برہنہ پاؤں پر

نہیں منعم کو اس کی بوند نصیب
مینہ برستا ہے جو گداؤں پر

نہیں محدود بخششیں تیری
زاہدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجئے کس مومنہ سے ان خطاؤں پر



کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جاننے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر

دوست اس کے ہیں نہ اس کے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیرِ نر

اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقین
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

مگر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر

عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوائے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر

دوست اک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہشِ تحسین ہے حضرت کو مگر



ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
دامِ انھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر

گو ہوشفا سے یاس پہ جب تک ہم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کیے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر

آبادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی
مبروض کو رہے گا نہ عریاں کیے بغیر

عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آ پڑی ہے ضد
چھوڑیں گے نیم جاں کونہ بے جاں کیے بغیر

مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلےں گے نہ آساں کیے بغیر

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دل ربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت انہیں نہ مسلمان کیے بغیر

حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر

ر

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ
ہو گئی ایک ایک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آج تک قصرِ اہل ہے ناتمام
بندھ چکی ہے بارہا کھل کھل کے پاڑ

ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھینا آتا ہے ہم کو بھی شکار
پر نہیں زاہد کوئی ٹی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے

سوشبتاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ

عمید اور نور روز ہے سب دل کے ساتھ

دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اجاڑ

کھیت رستے پر ہے اور رہو سوار

کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ

بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی

ان دنوں بکتر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں

کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

ز

عہدِ وصالِ دل نے بھلایا نہیں ہنوز
عالمِ مریِ نظر میں سمایا نہیں ہنوز

پیغامِ دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز
جھوکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز

لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

آیا نہ ہو گا اس کو تغافل میں کچھ مزا
ذوقِ نگاہِ ہم نے جتایا نہیں ہنوز

ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا
اس نے نقاب رخ سے اٹھایا نہیں ہنوز

یاں دے چکی جواب امیدِ جوابِ خط
وہاں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز

پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا
کافر نے اختلاط بڑھلایا نہیں ہنوز

کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد
بھولے ہمیں کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

سرمایہٴ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل
باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اس قدر
حالی نے جامِ مونیہ سے لگایا نہیں ہنوز



جیتے جی موت کے تم مونہہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مرگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں
کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
نوجوانی میں نہ یہ روگ لگانا ہرگز

جتنے رُمنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھینڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنتے ہنتے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تر خاک
دفن ہو گا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی نہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانہ ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزرده و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کوسن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیرو زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز



رنجش و التفات و ناز و نیاز
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

شیخ! اللہ رے تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اک پتے کی جو ہم نے کہہ دی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری
 تو مٹی بھول ہم کو خاکِ حجاز
 آج مگر بھی ناچ اٹھیں گے
 مگر معنی کی ہے یہی آواز

قطعہ

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف
 چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
 رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا
 ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز
 ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف
 بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
 چھپتے پھرتے ہیں کبک و مہو سے
 گھونسلوں میں عقاب اور شہباز

ہے نہتوں کو رہگزر میں خطر

رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز

ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم

بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لبِ آرز

ناتوانوں پہ گد ہیں منڈلاتے

گھانکوں پر ہیں ہیز تیر انداز

تشنہ خوں ہیں بھوکے شیروں کے

حیلہ گر رو بہوں کے عشوہ و ناز

دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس

اور یادوں کے یار ہیں غماز

ہو گا انجام دیکھیے کیا کچھ

ہے پر آشوب جبکہ یہ آغاز

لے ابھی تک کھلی نہیں لیکن

غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر
موج ہائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھینرے ہوا کے لے ابھرے
یا گیا کھمکش میں ڈوب جہاز

کام اسے اپنے سوئپ دو حالی
نہیں جس کا شریک اور انباز

ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترے
چارہ یاں کیا ہے غیرِ عجز و نیاز

س

باز ب رحمت ہے متناطیس عصیاں اپنے پاس

رکھتے ہیں عاصی کُنندِ صیدِ غفراں اپنے پاس

عاجزوں سے مقدر کرتے ہیں اکثر درگزر

عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس

ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے

عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس

بامِ بتلایا بلند اور نارسا بخشی کُنند

رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس

خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے کسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر مرد کا موجود درمیں اپنے پاس
دست برد اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بھگت اللہ وہ مہرِ سلیمان اپنے پاس
دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویز اختلافِ رحماں اپنے پاس



چھیڑ اب نہ اے تصورِ مرگانِ یار بس
کافی ہے خار خارِ غمِ روزگار بس

یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے
غمخواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس

ہر داغِ فصلِ گل کی نشانی ہے اے صبا
گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس

ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں
اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس

دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ
یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس
آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر
کی نیند کیوں جرام بس اے انتظار بس
تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

ش

اک ہم کو مہم برسرِ ایام ہے درپیش
بنا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش

غفلت ہے کھیرے ہوئے ہے چار طرف سے
اور معرکہ گردشِ ایام ہے درپیش

وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز
اب اس مرضِ صعب کا انجام ہے درپیش

کو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں گئی اب شام ہے درپیش

وہ وقت گیا نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا
اب وقت خمارِ مئے گلغام ہے درپیش

امیدِ شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے
اب موت کا سننا ہمیں پیغام ہے درپیش

جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زہار
ظاہر ہے کہ عالی کو کوئی کام ہے درپیش

ص

ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطا میں خاص خاص
ہر مرض کو اس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دنیا سے مگر
رہزنِ دل میں ابھی اس کی ادائیں خاص خاص

گو زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گل
یاد ہیں لیکن وہ بلبلی کی صدائیں خاص خاص

زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
وقت میں کچھ خاص خاص اور ہیں لائیں خاص خاص

یوں تو ہے امید سب کچھ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے لے حالی خطائیں خاص خاص



درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بُخدا ایک ہی شخص

حور و غلاماں کے لیے لائیں دل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برآ ایک ہی شخص

قافلے گزریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اثنا نہ بنی عامر میں
فخر ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جنگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہے مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ سہی شیخ مگر ہے بُخدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالی پہ نہ چوڑ
شاعراب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

ض

عشق کو ترک جنوں سے کیا غرض
چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض

دل میں ہے اے خضرِ گمردقِ طلب
راہِ رو کو رہنمویں سے کیا غرض

حاجیو ہے ہم کو گمہ والے سے کام
گھر کے محرابِ دستوں سے کیا غرض

گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
ان کو چنگ و ارغنون سے کیا غرض

نیک کہنا نیک جس کو دیکھنا
ہم کو تفتیش دروں سے کیا غرض

دوست ہیں جب زخمِ دل سے بے خبر
ان کو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض

عشق سے بے مجتنب راہِ عبث
شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض

کر چکا جب شیخِ تسخیرِ قلوب
اب اسے دنیاے دُوں سے کیا غرض

آئے ہو حالی پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چکوں سے کیا غرض



دوست کا ناروا نہیں اعراض
دوستوں ہی کا کام ہے اغماض

چاہیے ایک سب کا ہو مقصود
گو ہوں سب کی جدا جدا اغراض

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھودئے ایک دکھ نے سب امراض

دیکھے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

لَا اَبَالِي بِاَنْ يُعَاتِبَنِي
كُلُّ نَاسٍ وَاَنْتَ عَنِّي رَاضٍ

مُنْعِمُوْا بِذَلِ خَيْرٍ مِّنْ يَّهْدِي
اِپنا مطلب اور اُس پہ سو اغماض

حق میں اپنوں کے سخت ممسک ہیں
جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض

رائی ہے کچھ علیل سی تیری
نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض

وعظ میں گل کترتے ہیں واعظ
مونہ میں ان کے زباں ہے یا مقراض

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
ہل لَنَا فِي رِزَا عِنَّا مِنْ قَاض

ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد
خارکش تجھ سے ہے سوا مرتاض

شیخ کی تھی یہ آخری تلقین
چاہیے زر تو اس سے کر اعراض

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

ط

رات گزری ہو چکا دورِ نشاط
طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط

دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط

دن اب اے دل منقبض رہنے کے ہیں
ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط

غنچہ چٹکا اور آ پنی خزاں
فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط

زینہ منبر ہے لغزش کی جگہ

جانو واعظ اسے راہِ صراط

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ

ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

کوچ کی حالی کرو تیاریاں

ہے قویٰ میں دم بدم اب انحطاط



چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ
برا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
نہ ستار ہے تو نہ غفار واعظ

نکل آئے گی مے کشی کی بھی علت
کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن

یہ جبہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ

نہ چھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زرتو

یہی ہے اگر حسنِ گفتار واعظ

مسلمان نہ ہم کاش حالی کو کہتے

ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

ع

اے بہارِ زندگانی الوداع

اے شبابِ اے شادمانی الوداع

اے بیاضِ صبحِ بحری السلام

اے شبِ قدرِ جوانی الوداع

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا

الوداع اے عمرِ فانی الوداع

روزگارِ ضعف و سستی اتصلا

وقتِ سعیِ جانفشانی الوداع

قطعہ

فرستِ عشق و جوانیِ الفراق
دورِ عیش و کامرانیِ الوداع

تجھ کو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں
اے نعیمِ جاوداں الوداع

تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں
اے خدا کی مہربانی الوداع

آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

غ

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ
دیکھ اس خرامِ ناز پہ اتنا نہ کر دماغ

ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں
حسلے سے یاں اجل کے نہیں ایک دم فراغ

یا رب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغِ باغ

دو چار گام نقشِ قدم مل کے رو گئے
آگے چلانہ آہوئے مٹکیں کا کچھ سراغ

آئیں پیس وہ شوق سے جواہلِ ظرف ہوں
ساقی بھرے کھڑا ہے مے لعل سے ایامِ غ

جنگل میں تختہ گلِ خود رو کو دیکھ کر
تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں
باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

ف

حق نہ ملانے کچھ بتایا صاف۔
اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف

آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھلی
مہرِ روشن نظر نہ آیا صاف

کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم
صاف تھے آپ سب کو پایا صاف

زاہدو ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

کیوں فقیروں سے رک گئے حالی
بھید تم نے نہ کچھ بتلایا صاف

ق

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لایق

نہ اپنا کلبہٴ احزاں ہے یار کے لایق

کرے گا کیا ترا کحل الجواہر اے کمال

نہیں یہ آنکھ ہی دیدارِ یار کے لایق

مکانِ عاریتی اور لباسِ بوسیدہ

بہت ہے زندگیِ مستعار کے لایق

غرور و حرص ہیں زیورِ عروسِ دنیا کے

بناؤ تھے یہی اس نابکار کے لایق

کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سر سبز
رہا نہ باغِ قدومِ بہار کے لایق

بس اب ہے فہلہٴ روباہ و گرگ پر گزران
رہا نہ شیرِ ثیاں خود شکار کے لایق

گنہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے
ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لایق

یہ ہم نے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ
مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لایق

گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی
تمہیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لایق

ک

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے بر ملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں
جہاں ہے راہزنِ خلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر
بنا ہے غوثِ زماں آج کل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رندو پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے امید ہے اس وقت
کہ یار یار سے ہو جائے گا جدا ایک ایک

چھپا کے اس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے
جب آپ مومنہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اس کی بندگی کا ادا
کیا ہے جس نے حقِ خواجگی ادا ایک ایک

امیرِ حاج کی ہمت میں گرنے آئے قصور
تو موجِ بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑالے گئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بھائی آگ
جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا ایک ایک

وہ عشق ہے نہ جوانی وہ تو ہے اب نہ وہ ہم
پہ دل پہ نقش ہے اب تک تری ادا ایک ایک

نہ ہم رہیں گے نہ حالی پہ دلخراش جہاں
رہے گی حالیِ دلگیر کی صدا ایک ایک

گ

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمین ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلاستوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو
ہے عشیرہ اور ان کا دودماں سب سے الگ

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور انکا رازداں سب سے الگ

جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں
رکتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ

اک چمن بہرِ تفرجِ رکھتے ہیں زیرِ بغل
روضہ و بستان و فردوس و جاناں سب سے الگ

کلبہٴ احزاں ہے روشن انکا جس مہتاب سے
ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ

سیکڑوں پھندوں میں بیاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل اُنکا تو وہاں سب سے الگ

شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے
درد مندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے تالیب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ



صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

عہدِ گیتی پر نہ پھولیں کامراں
آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ

علم کیا اخلاق کیا ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

روکے بُدخو کو بُدخوئی سے کیوں
آپ اپنی خو سے آ جائے گا تنگ

زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ
یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ

پاکبازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع
جو ہیں اچھے ان پہ سب کھلتے ہیں رنگ

کام کا شاید زمانہ ہو چکا
دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی امنگ

وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل
دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ

عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ
ہے ابھی کم حاصلِ افیون و بنگ

بڑھ گیا ہے رحمِ انسانی بہت
ہو گی ایجاد اب نئی توپ و تفنگ

قوم کو حالی نہیں اس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

ل

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل

یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل

رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف

اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل

ابک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں

ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل

کب تک آخر ٹھیر سکتا ہے وہ گھر

آ گیا بنیاد میں جس کی خلل

تاؤ ڈوبے یا کہیں کھیا ہو پار
تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ اہل

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی
لاچکے پودے بہت اگلوں کے پھل

دیکھے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع
ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل

کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں
وقت کوشش کا گیا شاید نکل

اب سنو حالی کے نوے عمر بھر
ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل

م

مدرسہ میں دہر کے روبر قفا بیٹھے تھے ہم
اٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ
زالِ دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم

صحبتیں اہلِ ورع کی سب گئیں نظروں سے گر
بزمِ رنداں میں یوں ہی اک روز جا بیٹھے تھے ہم

شیخِ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکا دور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم

ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تری
آدی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم

ہم سے خود دنیا ہی پھٹائی نہ حالی ورنہ یاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم



خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پرہراک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعان میں
گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پرگنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم

دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
 پر اسے آلودہ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم
 ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی
 جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم
 ہیں فدا ان دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
 پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم
 گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
 اک جہاں سے آپ کو لیکن خفا پاتے ہیں ہم
 جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
 اپنے میں گر شمع مہر و وفا پاتے ہیں ہم
 بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا
 گر کبھی توفیقِ ایثار و عطا پاتے ہیں ہم
 ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر
 دردِ خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھہرتے جاتے ہیں جتنے چشمِ عالم میں بھلے
 حالِ نفسِ دُوں کا اتنا ہی برا پاتے ہیں ہم
 جس قدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے
 کبر و ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم
 گو بھلائی کر کے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہے جی
 تہ نشیں اس میں مگر دردِ ریا پاتے ہیں ہم
 ہے ردائے نیک نامی دوش پر اپنے مگر
 داغِ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم
 راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
 دیکھیے کیا ڈھونڈتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم
 نور کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
 رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم



آگے بڑھے نہ قصہٴ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازوں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایہٴ عشقِ بتاں سے ہم
کھمدل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رقیبِ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

دورِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آگئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں مگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم اے منکرو نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنتے ہیں اس کے گریہِ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پاگئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

دلکش ہر ایک قطعہٴ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھنے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالیِ جاودہ بیاں سے ہم



یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرنیوں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانوں
اب دکھنی مجھے بھی تیری روئیاں ہیں

بننے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دہنو بری ہیں تیری
جب بدگمتیاں تھیں اب بد زبانیاں ہیں

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیرا
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیابیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شائیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں

ہو گا تو پہلے ہو گا لے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر ہنتے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط المرجل تم نے
اس سے بھی سخت آتی آگے گرائیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کز لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ زراں
یہ خوں فشائیاں ہیں یا گل فشائیاں ہیں



جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یاں ڈھونڈتے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں

چل کے نئی اک چال فلک نے کھودیے ہوش حریفوں کے
زد سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس انہیں گر اپنا ذرا ہو جاں اپنی بھی ان پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

واد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اسکو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

یاں تو بدولت زہد و دُرع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا پر کل کے لیے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سرتھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یاں سمجھو تم مہمان ہمیں



کی تو ہیں ہم نے بھی حالی کوچ کی تیاریاں
سو جھنتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

خوابِ راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار
ناگوار ان سے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی
سب کو کرنی ہوں گی پوری اپنی اپنی باریاں

زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال
اتنی بھی اسے عاقلو اچھی نہیں ہشیاریاں

بے مزہ سے اہلِ دین کی تر شروئی بھی مگر
اس سے پھینکی اہلِ دنیا کی ہیں ظاہر داریاں

گو طبیعت سے گئے سب مادے فاسد نکل
کم ہوئیں حالی نہ لیکن نفس کی بیماریاں



رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
 آج ہم شہر میں خون اپنا ہدر کرتے ہیں
 عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
 جنتی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں
 جرمِ خالق سے سوا پاتے ہیں جرمِ فقہا
 جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں
 کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ
 بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں
 زہد و طاعت کا سہارا نہیں جب سے زاہد
 یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب ہنر دکھلاؤ
ورنہ یاں عیب تو سب فرد بشر کرتے ہیں

غمز دو رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی جس میں کہ گھر کرتے ہیں

جی رکاوٹ سے جوان کی کبھی رک جاتا ہے
اک لگاؤٹ میں ادھر سے وہ ادھر کرتے ہیں

ایک یاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں

قیصر و زار کا یاں پیٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی گزر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رخصتوں ہی میں سفر کرتے ہیں



دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رہنے نکلیں گے سیکڑوں اس میں

کی نصیحت بری طرح ناصح
اور اک بس ملا دیا بس میں

ہو نہ بیٹا تو فرق پھر کیا ہے
چشم انسان و چشم زرگس میں

بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اس میں

نہ ہو قبضے میں جب عنانِ فرس
بیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں

جس سے نفرت ہے اہلِ نعمت کو
وہی نعمت ہے چشمِ مفلس میں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں
ورد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

جانورِ آدمی فرشتہ خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

آج کل چرخِ صلح جو ہے بہت
دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں

کی ہے خلوت پسندِ حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں



بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
ہیں مئے ناب کے دلّال قدح خوار نہیں

شہر میں ان کے نہیں جنسِ وفا کی بکری
بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں

کون سے وہ گلِ رعنا پہ نواج نہیں
کون سی زرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں

کبھی لیلیٰ پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا
اور جو پھر دیکھو تو دونو سے سروکار نہیں

اٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی ان سے
دل پھنسا کر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں

عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ
اور جو ہو کیل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں

نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا ان کو
در بدر جھانکتے پھرنے سے انہیں عار نہیں

بواہوس کام طلب بندہ نفس اہل ہوئے
ایک عالم ہے اسی رنگ میں دو چار نہیں

دعوے عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں
کہہ دو واللہ کہ صادق نہیں زہار نہیں



پھونکا ہے فصل گل نے صور آ کے پھر چمن میں
اک حشر ما ہے برپا مرغانِ نغمہ زن میں

بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے
بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں

بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا
پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

چپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہے چشمِ زرگس
قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

ہیں اور تو ادائیں ساری سہی قدوں کی
پڑنی ہے جان باقی بس سروِ نارون میں

ہے عیدِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں
جنگلِ بسا ہوا ہے سب عطرِ یاقمن میں

مونہہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نامِ اسلام
بارودِ بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

پھر زخمِ پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا
فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں

گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اس قصہ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی؟ اس پر کیا گزری انجمن میں

پائین بزم بھی اب ملنی نہیں اسے جا
روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

رو بہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملت
تھی سہناک کل تک جو شیر کے بُرن میں

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمن کی
ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں

قبرِ اولیس پر ہے بس فخر اب قرن کو
زندہ اولیس کوئی باقی نہیں قرن میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑادی
فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

ڈالی نہ ہو گی آگے اے دورِ چرخ شاید
جو اب کے تو نے ہل چل ڈالی ہے انجمن میں

فوج اور بہیر دونو پھرتی ہیں بے سری سی
گویا امیر لشکر مارا گیا ہے رن میں

خرد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا
لٹنے کی قافلہ کے پہنچی خبر وطن میں

بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب
جائیں کدھر کہ ہر سو دوں لگ رہی ہے بن میں

حالی بس اب نہیں یاں سننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پریکاں یا ہے زباں دہن میں



ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسّ ل و رنجِ راہ کا
خطِ کامرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دل و حشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں



پیاہم نے نہ جامِ بے کدورت بزمِ دوراں میں
خزاں کو لے گئے ہمراہ گر پہنچے گلستاں میں

نہیں کچھ منحصر دل بستگی زلفِ پریشاں میں
جو دل چاہے تو الجھے اک غبارِ دودِ پیچاں میں

اگر چھوڑا کمندِ جذبہٴ عشقِ زلیخا نے
نہ رہنے دے گا حسنِ خود نما یوسف کو کنعاں میں

تصور نے بھلایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو
نہ کچھ کلفت ہے زنداں میں نہ کچھ راحتِ شبستاں میں

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر
کہاں تک جی نہ گھبرائے الہی دردِ ہجران میں

زباںِ تقریر سے قاصر قلمِ تحریر سے عاجز
نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کام دل اے خضر
سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہے آبِ حیواں میں

نہ چھوڑے گی محبت یار سے ناکام عاشق کو
نسیمِ مصر کو آنا ہے اک دن بیتِ اہزاں میں

گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے
ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں

بہت دن چاہئیں یوسف کو تا پہنچے زلیخا تک
نکل کر چاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے حالی فرصتِ سیرِ جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں



اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

مجھ کو تم سے پر اعتماد وفا
تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

یونہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرصت غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دل سوز ہو تو کیجئے بیاں
 سرسری دل کی واردات نہیں

ذره ذره ہے مظہرِ خورشید
 جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
 عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں



کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجران میں نہیں
چاکِ دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

ہم نے کی سیرِ چمنِ غور سے اے بلبلِ زار
بات چبھتی ہوئی کوئی گلِ وریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا
فتنہ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں

محتسب! صدق و صفایاں ہے انہیں کے دم تک
مصلحتِ برہمیِ صحبتِ رنداں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھہر جائے گا
بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجران میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ ترے کاکلِ بیچاں میں نہیں

آدی ہو تو کبھی پاسِ محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجران میں نہیں

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثارِ کچھ اس مردِ مسلمان میں نہیں



غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں
شادیِ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں

خوبرویٰ کے لیے زشتیٰ خوب بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھ سا طرح دار نہیں

قول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار
ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشہ سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

حق ہوا کس سے ادا اس کی وفاداری کا
جس کے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں

دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کون سی راہ
کعبہ و دیر سے کچھ ہم کو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلعِ ثانی سن کر
جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں



میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

چشمِ بددور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ
غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں

ہو چکا ناز اٹھانے میں ہے گو کام تمام
بِذکرِ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں

مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا
دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں

اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلب گار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں



وحشت میں تھا خیالِ گل و یا سمن کہاں
لائی ہے بوے اُنس نسیمِ چمن کہاں

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی
جائے گا دیرِ چھوڑ کے اب برہمن کہاں

اہلِ طریق جس کو سمجھتے ہیں زاوِ راہ
وہاں دخلِ دستِ برد کو اے راہزن کہاں

فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیا و گھات میں
مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرف آشنا
لے جائے ہم کو دیکھئے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انہیں مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا
اب ہم کہاں ہوئے نشاطِ وطن کہاں

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں

روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے مجھ شوق کا دیوانہ پن کہاں



کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بُو الہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھٹا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں



مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو
مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو

نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عدو کا
اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بے قدر ہوں محفل میں تیری
کہیں ناخواندہ تو بھی میہماں ہو

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے
جسے سخی ہماری داستاں ہو

موڑ ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو



حکم ہے پیرِ مغاں کا کہ جو اپنی نہ گنواؤ
خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ

دل کو کس طرح سمجھئے کہ وہی ہے یہ دل
وہ امیدیں ہیں نہ ارماں وہ امنگیں ہیں نہ چاؤ

یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر
تو تو اچھا ہے مگر تیرے برے ہیں برتاؤ

دوست ہوں جس کے ہزاروں وہ کسی کا نہیں دوست
سچ بتا تجھ کو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ

تو وہی برقِ جہاں سوز ہے بن خواہ نہ بن
ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ

ایک ہی دوست اور اس سے ہمیں چھٹواتے ہو
ناصحو اب تمہیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ

ہو گیا ذکرِ قیامت تو اجیرن واعظ
باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ

تجھ کو اے ابرِ بلا دیکھ کے جی چھوٹ گیا
ایک ہی بار تم اے بادلو اس طرح نہ چھاؤ

پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا
ڈمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ

دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ امید
آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ

اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک
آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بہاؤ

قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

۵

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ

ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میرد مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

یہ طبلِ تہی ہیں جو بنکارتے ہیں
جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

دیا تو نے یاں جس بہانے سے چاہا
ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی خست سے واعظ
وہ گرمائے گا یہ پسجیں گے جب کچھ

تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب
نہیں نامحو تم پہ الزام اب کچھ

یہ ہے میر مجلس کہ چینی کی مورت
ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمہ چرب تاکا ہے شاید
یہ حالی کی عزت نہیں بے سبب کچھ



بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتسابِ شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کرو ذکر کم اپنی داد و دُش کا
مبادا کہ ثابت ہو خست زیادہ

پھر اوروں کی تکتے پھرو گے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن
جناؤ نہ اپنی محبت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا
جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ

نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے
خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ

ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم
پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت یاں ہم زمانہ کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ



حقیقتِ محرمِ اسرار سے پوچھ
مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن
مری الفت درودیوار سے پوچھ

ہماری آہِ بے تاثیر کا حال
کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ

دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری
کنندِ گیسوئے خمدار سے پوچھ

دل مہجور سے سن لذتِ وصل
 نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ
 نہیں جز گریہِ غم حاصلِ عشق
 ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ
 نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست
 کسی لبِ تہنہ دیدار سے پوچھ
 فریبِ وعدہ دلدار کی قدر
 شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ
 فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل
 یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ
 تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم
 وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ
 متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالی
 مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

کی

ہے ان کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی
وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ ان کی مہربانی

بے جرم کوئی آخر کب تک سے ملامت
ناصح سے ہم کو اپنی کہنی پڑی کہانی

عاشق کدل کو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے
دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی

امید و صل سے ہے کچھ جی چھڑائے دیتا
جو کچھ سنا ہے ہم نے مشاطہ کی زبانی

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی

صبر و سکوں سے ہم کو یہ بھی نبیڑنے دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہشِ نہانی

پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں
ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے
کیا جانے کس ادا سے کی اس نے دلستانی

اک نکتہ کے بیاں سے سرُبر نہ ہو گے حالی
چلتا نہیں کسی کا یاں لافِ نکتہ رانی



کہہ دو کوئی ساتی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے

جو کچھ ہے سو ہے اس کے تغافل کی شکایت
قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے

دلالہ نے امید دلائی تو ہے لیکن
دیتے نہیں کچھ دل کو تسلی یہ دلا سے

ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہِ خوباں
یاں ہیں تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے .

پیا سے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں
ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آبِ بقا سے

درگزرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے
درگزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

اک درد ہو بس، آٹھ پہر دل میں کہ جس کو
تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے

حالی دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین
شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے

جب وقت پڑے دیجیے دستکِ درِ دل پر
جھکے فقراً سے نہ جھکے امراً سے



کبک و قمری میں ہے۔ مھکڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے

م سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلمان نہ سبھی نہ یہود
دوست کیا جانے یہ چرخ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا
ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے

آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق
عزمِ تسخیر پھر اے شیخِ زمن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و سرین و سمن کس کا ہے

عشق ادھر عقل ادھر دھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھئے دونو میں کٹھن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مرغِ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مُشکلِ واعظ و حالی دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے



ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سپاہ و میرِ سپہ باغ باغ ہیں لیکن
بہیر روتی ہے اور ہاتھ ملتے جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرنے آئے ہیں احباب
کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے

قلق انہیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیئے خلیجان بینوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز
زمین بھی اپنے خزانے اگلتی جاتی ہے

اڑے گی خاک تقدس کی اب سرِ بازار
فقیہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے



بری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی

ملے گا نہ گلچیں کو مُکھل کا پتا
ہر اک پتھری یوں بکھر جائے گی

رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی

ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر
یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی

بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ
یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی

نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں
یونہی عمر سازی گزر جائے گی

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی



سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی

نیکل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے کلمشن میں
یہ کلمچینی ہے یا لٹس ہے کلمچیں یا ہے قزاقی

کمال کفش دوزی علمِ افلاطون سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

رہی دانائی آخر غالب آ کر پہلوانی پر
گئے چیں مان سب چینی و فرغانی و قباچی

ہمارے طرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ
لنڈھانے خم پہ خم غیروں پہ کیوں مسک ہو گرساچی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک ٹغیب کا باقی



اہلِ معنی کو ہے لازمِ سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشا سائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز
اس میں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مندی
اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

جو چھپاتے ہیں حق اندر وہ رسوائی سے
گھات میں ان کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی

دوست گر بھائی نہ ہو دوست ہے تو بھی لیکن
بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

اے غم دوست تجھی پر نہیں اپنی گزران
کچھ فتوح اس کے سوا اور ہے بالائی بھی

دل غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دنیا جو لوگ
تیور ان کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

عقل ہے اپنی حماقت کے چھپانے کی نہیں
جن میں کچھ ساتھ حماقت کے ہے خودرائی بھی

عقل اور حسن پہ جن کے بھری مجلس ہو گواہ
ان کو خودرائی بھی پھبتی ہے خود آرائی بھی

ملنے دے گی نہ اجل تم سے ہمیں جی بھر کر
فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم پہ رہے مردوں سے بدتر حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی



رہا کھل کے زاہد کا زہرِ ریائی
بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

برائی ہے رندوں میں بھی شیخ! لیکن
کہاں یہ برائی کہاں وہ برائی

گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب
عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی

رکا ہاتھ جب بن گئے پارسا تم
نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے
سوا اس کے منعم میں ہے کیا بڑائی

جو کہیے تو جھوٹی جو سنیے تو سچی
خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی

ہوئی آ کے پیری میں قدرِ جوانی
سمجھ ہم کو آئی پہ ناوقت آئی

وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پر بت
وہ پر بت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی

جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح
جو وہاں دل پہ لی تھی تو یاں مونہہ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی



وصل کا اس کے دل زار تمنائی ہے
نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

قطع امید نے دل کر دیئے یکسو صد شکر
شکل مدت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے

قوتِ دستِ خدائی ہے تھکیبائی میں
وقت جب آ کے پڑا ہے یہی کام آئی ہے

ڈر نہیں غیر کا جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے
ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سذک کھائی ہے

نشہ میں چور نہ ہوں جھانجھ میں مخمور نہ ہوں
پند یہ پیرِ خرابات نے فرمائی ہے

نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی
بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے



اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دو چار
آئے اس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گراں ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ کئی حرص و آرزو انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے

چیونٹوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
تجھ میں جوت اے شمع ہے کس برقِ عالم سوز کی
جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے
دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے



تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی
رہ گیا کیا ہے اب اے گبرو مسلمان باقی

بزمِ دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اس وقت
میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی

حق ادا اک نگہِ لطف کا ہو گا کیونکر
دل و دین لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی

ظاہرا درد ہی الفت کا نہیں چارہ پذیر
ورنہ چھوڑا نہیں ہم نے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی



پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا کیے اور مہرباں رہے
کیا کیا ہیں دل میں دیکھئے ارماں بھرے ہوئے
ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتہ امید
اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی
اتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے
نرخِ متاعِ عشق، الہی، گراں رہے
حالی سے مل کے ہو گے تم افسردہ دل بہت
انگلے سے دلو لے وہ اب اس میں کہاں رہے



کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

یارانِ تیز گام نے محل کو جا لیا
ہم محوِ نالہ جرسِ کارواں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ
یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

وصلِ مدام سے بھی ہماری نبھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے

کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا زو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے



حق و وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر الفت بہت جتانے لگے

تم کو کرنا پڑے گا عذرِ جفا
ہم اگر دروِ دل سنانے لگے

سخت مشکل ہے شیوہ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغان
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِ باطن کو فاش کر یارب
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے



حشر تک یاں دل بھگیا چاہیے
کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے

ہے بخلی بھی نقابِ روئے یار
اس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے

غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اسکو لکھا چاہئے

ہے دل افکاروں کی ولداری ضرور
گر نہیں الفت مدارا چاہئے

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہئے

دوستوں کی بھی نہ ہو پروا جسے
بے نیازی اس کی دیکھا چاہیے

بھاگئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کبھی اغماض جتنا چاہیے

شیخ! ہے ان کی نگہ جادو بھری
محبتِ رنداں سے بچنا چاہیے

لگ گئی چپِ حالی رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے



جنوں کا فرما ہوا چاہتا ہے
قدمِ دشتِ پیا ہوا چاہتا ہے
دمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشکِ اشکِ دریا ہوا چاہتا ہے
خط آنے لگے شکوہ آمیز ان کے
ملاپ ان سے گویا ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے

مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت

کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

فزون تر ہے کچھ ان دنوں ذوقِ عصیاں

درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی

کوئی دن میں رُسا ہوا چاہتا ہے

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک

دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

بہت حظ اٹھاتا ہے دل تجھ سے مل کر

قلق دیکھئے کیا ہوا چاہتا ہے

غمِ رشک کو تلخ سمجھے تھے ہم

سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی

کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے



جس کو غصے میں لگاؤٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجھے
اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے

شیخ یاں شرمِ گنہ شوق بھلا دیتا ہے
تو بہ ان کی ہے جنہیں اپنی خطا یاد رہے

وادیِ عشق میں موسیٰ کو ہو گر رخصتِ دید
ہاتھ کنوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے

خضر نے پانو اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہِ آب بقا یاد رہے

دل بری طرح لگا عشقِ بتاں میں اے شیخ
دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے

چارہ گر! کار باندازہ تدبیر نہیں
کچھ ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا یاد رہے



ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالہ تقدیر کر چکے

افسوں شبِ وصال کے وہاں کارگر نہیں
نالے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے

اے دل اب آزمائشِ تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحانِ برشِ شمشیر کر چکے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصورِ مرثاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے

جاں لب تک انتظار میں آتی ہے بار بار
مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے

دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے



نہ وہاں پر سش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

بناوٹ سے نہیں خلی کوئی بات
مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی
جو سچ پوچھو تو جائے سوءِ ظن ہے

بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار
تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

دلالتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت

مگر جوشِ سخنِ مہرِ دہن ہے

رہے لاہور میں آکر سو جانے

یہی دنیا ہے جو دارالحمین ہے

نہیں آتی کہیں یاں بوے یوسف

مگر جو گھر ہے وہ بیتِ الحزن ہے

یہاں بے گانگی ہے اس قدر عام

کہ بلبلِ ناشناساے چمن ہے

نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ

نہ کچھ شیریں کو دردِ کوبکن ہے

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور

تصور میں مرے اک انجمن ہے

مری خلوت میں ہے ہنگامہ بزم

خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو
جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی
مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے

نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام
یہی گر جذبہٴ مہرِ وطن ہے

گریں نظروں سے سب باتیں پرانی
مگر الفت کہ اک رسم کہن ہے

بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی!
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

کیا ہے اس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے



دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خودنمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن
ہم سے باتیں کرو صفائی کی

دل رہا پائے بندِ الفتِ دام
تھی عبث آرزو رہائی کی

دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے
رکھے امید دل ربائی کی

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے
بو نہیں آتی آشنائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

بخت ہمداستانی شیدا
تو نے آخر کو نارسائی کی

صحبتِ گاہ گاہ ہی رشتگی
تو نے بھی ہم سے بے وفائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوسِ حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی



کر دیا خوگرِ جفا تو نے
خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دور پہنچی تھی اپنی آزادی
پر خدا جانے کیا کیا تو نے

کیوں نہ آئیں گے یاں وہ اے ہدم
بس سنا میں نے اور کہا تو نے

گوشِ دل ساتھ لائے تھے ہم آج
نہ کہا اور نہ کچھ سنا تو نے

صبر کا ہے بہت بُرا انجام
ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے

ابتدائے وفا ہے سر دینا
میری دیکھی نہ انتہا تو نے

دل سے قاصد بنا کے وعدہ وصل
اور کھویا رہا سہا تو نے

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک
ہم کو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالی اپنا کہا سنا تو نے



کر کے بہار دی دوا تو نے
جان سے پہلے دل لیا تو نے

رہرو تشنہ لب نہ گھبراتا
اب لیا چشمہ بھا تو نے

شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا
آ کے مسجد سے کیا لیا تو نے

دور ہوئے دلِ مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزا تو نے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ
کیا کیا چشم آشنا تو نے

دل و دین کھو کے آئے تھے سوئے دیر
یاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے امیدِ خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے



دل کو درد آشنا کیا تو نے
دردِ دل کو دوا کیا تو نے

طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا
خاک کو کیمیا کیا تو نے

وصلِ جاناں محال ٹھہرایا
قتلِ عاشق روا کیا تو نے

تھانہ جز غم بساطِ عاشق میں
غم کو راحت فزا کیا تو نے

جان تھی اک وبالِ فرقت میں
شوق کو جاں گزا کیا تو نے
تھی محبت میں ننگِ منتِ غیر
جذبِ دل کو رسا کیا تو نے

قطعہ

راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی
درِ مے خانہ وا کیا تو نے
قطع ہونے ہی جب لگا پیوند
غیر کو آشنا کیا تو نے
تھی جہاں کارواں کو دینی راہ
عشق کو رہنما کیا تو نے
ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی
عقل کو ناخدا کیا تو نے

بڑھ گئی جب پدر کو مہر پسر
اس کو اس سے جدا کیا تو نے

جب ہوا ملک و مال رہن ہوش
بادشہ کو گدا کیا تو نے

جب ملی کام جاں کو لذت درد
درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہرو کو ذوق طلب
سعی کو نارسا کیا تو نے

پردہ چشم تھے حجاب بہت
حسن کو خود نما کیا تو نے

عشق کو تاب انتظار نہ تھی
غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے

حرم آباد اور دیر خراب
جو کیا سب بجا کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھے احباب
ہم کو جادو نوا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب
کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

رباعیات

توحید

کانٹا ہے ہر اک جگر میں انکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا



بندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا



طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
 جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
 اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
 وہاں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا



جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
 منکر بھی پکار اٹھتے ہیں تجھ کو مجبور
 خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ
 خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور



جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
 دشمن سے بھی نام تیرا چپواتی ہے
 ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال
 لیکن انہیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے



مٹی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں
 کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرارِ عیاں
 پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک
 گنجینہٴ غیب میں اسی طرح نہاں



ہستی سے ہے تیری رنگ و بوسب کے لیے
 طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
 ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
 سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے



کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد
 دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
 پر جو کہ ہیں تجھ سے نو لگائے بیٹھے
 رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد



زہاد کو تو نے محوِ تجید کیا
 عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
 طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی
 توحید کو تو نے آ کے توحید کیا



بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا
 اور اُمیوں کو خیر ام تو نے کیا
 اسلام نے ایک کر دیا روم و تار
 بچھڑے ہوئے گلہ کو بہم تو نے کیا



بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
 یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
 اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
 آبا کو بھی ہے تیری ابوت سے شرف

صلحِ کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
 شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
 جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
 وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترکِ شعرِ عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
 بزمِ شعرا میں شعرِ خوانی چھوڑی
 جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
 ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح
 ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
 دل ان کے ہیں ظرف ان کے جو کرتے ہیں ٹیر
 ہنس بول کے چیری کو جوانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں
پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہیے اب کیا ہے صلاح
فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر
اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھیرائیو بد اے فرزند
 ایک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
 کچھ نقص اتار کی لطافت میں نہیں
 ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند
 دوستوں سے بے جا توقع

تا زیت وہ محو نقشِ موہوم رہے
 جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
 اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
 صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو مفتوں
 گردن پہ نہ لہو عقلِ خداداد کا خون
 خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم
 کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
 پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور
 عیب اپنے گھٹاؤ پر خردار رہو
 گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ کم
 ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
 بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
 بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں
 پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
 عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہے مگر
 عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بنانا چاہئے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفان و یقین
پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجامِ ترقی بشر
یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انسان میں عیب
ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب بند

مصرف کو کیونکر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

اک منعمِ مصرف نے یہ عابد سے کہا
کر میرے لیے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سونے چرخ
محتاج کر اس کو جلد اے بارِ خدا

کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہے نفس میں انساں کے جبلی یہ مرض
ہر سعی پہ ہوتا ہے طلب گارِ عوض
جو خاص خدا کے لیے تھے کام کیے
دیکھا تو نہاں ان میں بھی تھی کوئی غرض

انقلابِ روزگار

بس بس کے ہزاروں گمراہ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علم لاکھوں اکڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہے نوبت تو کل اس کی باری
بن بن کے یونہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضائے سن

حالی کو جو کل فردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید
وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا

دنیاے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
 اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
 بچے آوارہ اور بے کار جوان
 ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
 برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
 مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان
 یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا
 شیریں سخن سے شہیدِ فائق ہونا
 ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق
 آساں نہیں مقبولِ خلاق ہونا

مسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمن اخواں پکا
 ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکا
 ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے
 سنتے ہیں کسی کو جب مسلمان پکا

مکروریا

حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا
 خطرہ انہیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
 لیکن ان بھیلڑیوں سے واجب ہے حذر
 بھیلڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں
 پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
 عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ
 جیسے طوسی و رازی انہیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھیرایا تجھے راس المال



اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمہٴ نعماء و ایادی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلہٴ دیں کا ہادی تو ہے



ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیضِ تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخب کی طرح
رہتی ہیں شعاعیں تیری محدود وہیں

خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کھات کا نسب بھی عالی
پر اس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے
عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا مجھ سے ہی عزت ہے جہاں
فرمایا ہنر نے میں ہوں عزت کا نشان
عزت بولی غلط ہے دونو کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں
توقع بے جا

ہیں یار رفیق پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوع بشر کی خود جبلت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی
 اتنی ہی مغائرت ہے یاں اور خویشی
 وہ دوست نہیں جس نے کیا فکرِ مآل
 ضدین ہیں دوستی و دور اندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
 ہر قبہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے
 جس قوم کو عیشِ دوست پاتا ہوں میں
 کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے



اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا
 سلطان کو گدا غنی کو محتاج کیا
 ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل
 بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
 بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
 اوروں کی برائی ہی ہے فخر وہاں
 خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

عشق

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ
 پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ
 دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری
 قوموں کو ذلیل خاندانوں کو تباہ

سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
 سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
 یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت
 یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

دین و دنیا کا رشتہ

دنیا کو دیئے دین نے اسرار و حکم
دنیا نے کمر دین کی تھامی جس دم
گر دین کی ممنون بہت ہے دنیا
دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم
آزادگان راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ
کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت
لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ
بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار
اس قوم کا چیتنا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پروا
ذلت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

عفو باوجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی ہے

فتنہ کو جہاں تک ہو دیجے تسکین
زہر اگلے کوئی تو تیجے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے
اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمت

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام لے کے پہنچا تو کہا
”مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار“

کم ہمتی

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا
ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے ندامتوں کی جانا ہم نے
دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

تاسف بروفاتِ نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم نیر تخلص دہلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز
آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبلی زار
سو اس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز



غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیرِ باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انورِ باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

گدائی کی ترغیب

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا
کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا ان کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنہوں نے مانگنا سکھلایا

تکفیرِ اہلِ اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں
 سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقین
 مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال
 تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو
 کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
 افسانہ قیس و کوہکن یاد نہیں
 چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
 اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
 مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
 دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اول کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے
پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوح نے طوفاں سے
کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لیے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح
مردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے
جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سمونے والے
بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام
اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار

بدظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دو چار

طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر

کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

سکوتِ درویشِ جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ

خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ

بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت

معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکرِ قران و خبر

کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر

کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ

کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا
 ہو گا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
 دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر
 اس سے بھی گیا کہ جس کے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت نہ ہو جب کانوں میں
 دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں
 غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح
 دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفاہر جا باقی
 کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
 دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
 دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سن کر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور
 داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
 ہوتے ہیں بہت وہ مدح سن کر ناخوش
 مقصود یہ ہے کہ ہو ستائش کچھ اور

حسنِ ظنِ اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں
 نیکی میں شک اس کی کوئی لایا ہی نہیں
 ہو سکے رانج میں بھی شاید کچھ کھوٹ
 پر اس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں
 دینداروں کی برائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حال اہلِ اسلام
 اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
 بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار
 اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

فکر عقبی

منزل ہے بعید باندھ لو زاد سفر
 موج ہے بحر رکھو کشتی کی خبر
 گاہک چوکس ہے لے چلو مال کھرا
 ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگذر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انسان
 ممکن ہے بڑی کا نہ رہے اس میں نشان
 ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے
 انسان ہے اب تک وہی قرن الشیطان

سلاطین کا عشق

ہر چند برا ہے عشق کا سب کے مآل
 پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
 سلطان ہے اگر ظلِ الہی تو عشق
 ہے ظلِ الہی کے لیے وقتِ زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ
 پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
 ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی
 پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا
 بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہئے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر
 انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
 کیفیتِ شب اٹھا چکے اب حالی
 مجلس کرو برخاست ہوا وقتِ سحر
 دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
 زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
 جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک
 ہے جوہرِ انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابلِ عفو ہے

غصہ پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں
جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر
پھر کس سے ہوں آزرده کہ تو تو ہی نہیں

سبھا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری
کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر (نصیبِ اعدا)
رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لا علاج ہے

اب ضعف کے پنجہ سے لکنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال
آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

اسراف

مصرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
 نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
 گر بخل پہ لوگ ان کے ہنسیں بہتر ہے
 اس سے کہ فضولیوں پہ ان کی روئیں

ردِ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے نہ صواب
 زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
 بدتر ہے ہزار بار اے دُوں ہمت
 سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں
 جو دیکھ کے چکھ کے دل سے بھائے ہیں ہمیں
 پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک
 جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
 مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
 سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی
 اندیشہ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال
 اچھوں کو برا سننے میں بھی مزا آتا ہے

رکتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
 جو کر کے بھلا خلق سے سنتے ہیں برا
 ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا حالی
 آتا نہیں ان کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکریہ مدحِ کلامِ راقم

جوشِ خمِ بادہ جامِ خالی میں ہوا
 پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
 تسلیم نے دی کچھ اس طرح دادِ سخن
 مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

احسانِ بے منت

احساں کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو
 تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
 کرتے ہو گر احساں تو کر دو اسے عام
 اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو
 قانونِ بد اخلاقی سے مانع نہیں ہوتے
 قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار
 حاشا کہ ہو ان پہ نظمِ عالم کا مدار
 جو نیک ہیں ان کو نہیں حاجت ان کی
 اور بد نہیں بنتے نیک ان سے زہار
 مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں
 حق بول کے اہل شر سے اڑنا نہ کہیں
 بھڑکے گی مدافعت سے اور آتش کیس
 گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہل خلاف
 جز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

نیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں نل
 اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
 کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور
 ہے نیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل
 انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
 اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
 اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
 بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں
 بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں
 دل دیتے ہیں پر جی سے گزرتے نہیں یوں
 تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
 جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درستی سے کیا اس سے کلام
بولتا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے
ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

نواب وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اس کی چھوڑ دی ہمراہی
اقبال پہ جس نے فتح یابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی ان سے
ہے جن کی رگوں میں خونِ آصف جاہی

رباعیاتِ قدیم

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت



مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ وفا پہ جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روئے تھے تو اب روئیں گے



فرقت میں بشر کی رات کیونکر گزرے
اک خستہ جگر کی رات کیونکر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیونکر گزرے



یاد اس کی یہاں دردِ مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجیے کہ ہے نام اس کا
کس طرح نہ کیجیے کہ کام اپنا ہے



کیا پاس تھا قول حق کا اللہ اللہ
 تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
 میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ
 لا حول ولا قوۃ الا باللہ



حرکتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
 گمراہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
 سرگشتگی کوئے ضلالت کب تک
 اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل



گر کفر میں فرعون کا مانی نکلا
 اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
 سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید
 واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

قصیدے 'ترکیب بند' مسدس چند اور قطعے مختلف مضامین پر

بہ ترتیب اوقات تحریر

۱۔ قصیدہ نعتیہ

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دو جہاں کے لیے
خُن زباں کے لیے اور زباں وہاں کے لیے

وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں
عداوت اس کی عذابِ الیم جاں کے لیے

وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام
محبت اس کی حصارِ حصیں اماں کے لیے

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم
رہا نہ تفرقہ روز و شب زماں کے لیے

وہ پھول جس سے ہوئی سہی باغباں مشکور
رسی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کے لیے

ہلالِ مکہ کا ماہِ دو ہفتہ شرب کا
فروعِ قوم کے اور شمعِ دو دماں کے لیے

گھر اس کا موردِ قرآن و مہبطِ جبریل
در اس کا کعبہ مقصود انس و جاں کے لیے

پہر گرمِ طواف اس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لیے

وہ لحظہ لحظہ تفقہ وہ دمبدم الطاف
رضائے خاطرِ یارانِ جانفشاں کے لیے

وہ گو نہ گو نہ مدارا وہ بات بات میں مہر
کشائشِ گرہِ کینِ دشمنان کے لیے

کہ افتخارِ مقابل میں اہلِ نخوت کے
کہ انکسارِ مداراتِ میہماں کے لیے

کہیں ہلاک میں تاخیرِ قوم سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیلِ ناتواں کے لیے

صفائے قلبِ حسود ان کینہ خواہ کے ساتھ
دعاے خیر بد اندیش و بدگماں کے لیے

کہیں مقدمۃً لہجیشِ انبیاء و رسل
کہیں وہ خاتمۃً البابِ داستاں کے لیے

مدینہ مرجع و ماوائے الملکِ مکہ ہوا
کیس سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیے

اسی شرف کے طلب گار تھے کلیم و مسیح
نویدر امتِ پیغمبرِ زماں کے لیے

بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہزن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لیے

شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے
بشارتِ امتِ عاصی و ناتواں کے لیے

شفاعتِ نبویٰ ہے وہ برقِ عصیاں سوز
کہ حکمِ خس ہے جہاں کفرِ دو جہاں کے لیے

خدا کی ذاتِ کریم اور نبیؐ کا خلقِ عظیم
گنہ کریں تو کریں رخصت انس و جاں کے لیے

اسی کا دیں ہے کہ ہے گلشنِ ہمیشہ بہار
وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لیے

عبور بے عصیاں سے کس طرح ہو اگر
وہ ناخدا نہ ہو اس بحرِ بیکراں کے لیے

مریضِ حرص و ہوا پائے کب شفا جب تک
وہ چارہ گر نہ ہو اس دردِ جانستاں کے لیے

نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام و لب میں سکت
حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیے

ارادہ عرش تک اک آن میں پہنچنے کا
کیا تھا عزمِ اولو العزم نے کہاں کے لیے

کرم کا دیکھئے دامن کہاں تک ہو فراخ
ہو میزبانِ خدا جب کہ میہماں کے لیے

زمیں پہ ٹھیرا ہے ماوائے شاہِ عرشِ نشین
 رہی نہ اب کوئی فوقیتِ آسماں کے لیے
 اسی سے ہوتا ہے ظاہرِ عیارِ استعداد
 محک ہے حُتِّ نَبیٰ دل کے امتحاں کے لیے
 اگر نصیب ہو یشرب میں جا کے شربتِ مرگ
 پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے
 اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسر آئے
 کروں نہ طولِ اہلِ روضہٴ جناں کے لیے
 سمایا اس کا جو نقشِ قدم تصور میں
 ہجومِ شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے
 حریفِ نعتِ حیمبرؐ نہیں سخنِ حالی
 کہاں سے لائے اعجاز اس بیاں کے لیے
 نبیؐ کا نام ہو وردِ زباں رہے جب تک
 سخنِ زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

۲- ترکیب بند مرثیہ ۱۲۸۵ء ہجری

مرثیہ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ غالب



کیا کہوں حالِ دردِ پنهانی
وقتِ کوتاہ و قصہ طولانی

عیشِ دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی

کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال
گوشہ فقر و بزمِ سلطانی

ہے سراسر فریبِ وہم و گمان
تاجِ مغفور و تختِ خاقانی

بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب
جامِ جمشید و راجِ ریحانی

لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی
حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی

ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی
اک تماشا ہے حسنِ کنعانی

نہ کروں تعلقِ میں تر لبِ خشک
چہرہٴ خضر کا ہو گر پانی

لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے
گر ملے خاتمِ سلیمانی

بجز ہستی بجز سراب نہیں
چہرہٴ زندگی میں آب نہیں



جس سے دنیا نے آشنائی کی
اس سے آخر کو کج ادائیگی

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر
تو نے کی جس سے بے وفائی کی

ہے زمانہ وفا سے بے گان
ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی

یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی
صلح میں چاشنی اڑائی کی

ہے یہاں حَقِّرِ وِصْلِ سے محروم
جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی

ہے یہاں حَفِظِ وِضَعِ سے مایوس
جس کو عادت نہ ہو گدائی کی

خندۂ گل سے بے بقا تر ہے
شان ہو جس میں دلربائی کی

جنسِ کاسد سے ناروا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رہکِ عرفی و فخرِ طالبِ مُرد
اسد اللہ خان غالبِ مُرد



بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس
پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضمونوں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بالمثل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خوابہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا



دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعرو غزل
کس سے داؤِ سخنوری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضمون ہے نوحہ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میتِ جنازہ ٹھیرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں تزیین
اہلِ انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرطِ مومنہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہِ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت



نثر حسن و جمال کی صورت
نظم غنچ و دلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئینہ جس میں
نظر آتی تھی، حال کی صورت

اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکلِ امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگِ ہجراں وصال کی صورت

لطفِ آغاز سے دکھاتا تھا
خُن اس کا مآل کی صورت

چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوحِ امکاں سے آج مُتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ



شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشک بار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع
رخستِ موسمِ بہار ہے آج

بارِ احباب جو اٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات بیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دل میں مدت سے تھی خلش جس کی
وہی بر چھی جگر کے پار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکین
ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج

تلخیِ غم کہی نہیں جاتی
جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد



نقدِ معنی کا گنجدان نہ رہا
خوانِ مضمون کا میزبان نہ رہا

ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن
اب کچھ اندیشہ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں سالار
کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونقِ حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازارِ گلرُ خاں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشان نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجمان نہ رہا

اہلِ ہند اب کریں گے کس پر تاز
رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نامِ ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھیرائیں اب مدارِ سخن



کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا

شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسین
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

قطعہ

نذرِ سائل تھی جان تک لیکن
درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا

ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا
جان دینے پر اختیار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیِ لفظِ آدمیت تھا



کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں
آج بلبل نہیں گلستاں میں

شہر سارا بنا ہے بیتِ حزن
ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں
اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی
ڈھونڈتے کیا ہو سب و رماں میں

لبِ جادو بیاں ہوا خاموش
گوشِ گلِ وا ہے کیوں گلستاں میں

گوشِ معنی شنو ہوا بے کار
مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں

وہ گیا جس سے بزمِ روشن تھی
شمعِ جلتی ہے کیوں شبستاں میں

نہ رہا جس سے تھا فروغِ نظر
سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آگنیِ ظلمت
آبِ حیواں پہ چھا گئی ظلمت



ہند میرا نام پائے گا اب کون
سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون

ہم نے جانی ہے اس سے قدرِ سلف
ان پر ایمان لائے گا اب کون

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون

تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش
وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلی سے آئے گا اب کون

مر گیا قدردانِ فہمِ سخن
شعر ہم کو سنائے گا اب کون

مر گیا تھنہ مذاقِ کلام
ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون

تھا بساطِ سخن میں شاطرِ ایک
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

۳۔ قصیدہٴ نعتیہ

میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور
مجھ سے انھیں گے ان کے نازِ ضرور

خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
مجھے سے برتر ہے میری طبعِ غیور

خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے
میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور

نہ گنو اہلِ عصر میں مجھ کو
میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور

چشمہٴ آبِ خضر کی مانند
چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور

دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور

مثلِ یوسف دکھائے جوہرِ ذات
جس کو بکنا ہو مفت یاں منظور

جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر
ہوں زمانہ کے ہاتھ سے مجبور

بک و قمری کو رخصتِ پرواز
بال و پر مفتِ صعوبت و عصفور

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور

لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اس کو کیا قدرِ خوشہ انگور

جس کے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روزِ روشن ہے یا شبِ دیکور

پہلے ہو گی کسی کو قدرِ ہنر
اٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور

دردِ دل کا بیاں کروں کس سے
بات کھونی نہیں مجھے منظور

سخنِ حق کی داد لوں کس سے
سن چکا ہوں فسانہ منصور

دلِ آباد مفتِ بے ہنراں
ہو چکا خانہ ہنر معمور

مژدہ خسرو کو وصلِ شیریں کا
ہو چکی سعی کوہکن مشکور

ہم نے دیکھی تمیزِ اہلِ نظر
ہم نے دیکھا مذاقِ اہلِ شعور

ہے غرض ان کو صوتِ موزوں سے
نالہٴ دل ہو یا نوائے طور

ہو کسی شے سے ان کی گرمیِ بزم
داستاں ہو وہ یا کہ درسِ زبور

ہے فقط روشنی سے ان کو کام
موم ہو اصلِ شمع یا کافور

ہے یہاں قائلِ انا مردود
ہو وہ فرعونِ وقت یا منصور

آپ اپنے خن سے ہوں محفوظ
دلِ اصحاب گو نہ ہو مسرور

یاں اگر کام ہے تو شیریں سے
قصرِ خسرو کے اور ہیں مزدور

دلِ احباب پر نہیں چلتا
سحر میرا کہ رہیو غیر سے دور

ہوں تماشاے شہرِ نابینا
ہے برابر مرا خفا و ظہور

دورِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب
ماہِ کامل ہوں اور ہوں بے نور

چشمہ پیدا و کارواں تشنہ
بادہ پر زور و انجمن مخمور

اس زمانے میں وہ غریب ہوں میں
جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور

صاحبِ قدر و جاہ ہے جب تک
کار فرما ہے چین میں فغفور

کاش اس عہد میں مجھے پاتے
تھا سخن جب کہ قبلہ جمہور

کاش وہاں دیکھتے مجھے کہ جہاں
متنبی تھا مادیحِ کافور

کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپور

کون دیکھے مرے چمن کی بہار
مر گیا عندلیبِ نیشا پور

جس سے ہوتا ہے خستہ سینہ ہوش
ہے زباں میری وہ دمِ ساطور

جس سے ہوتا ہے کور پروانہ
ہے مری شمع میں وہ لمعہ نور

شرحِ نقطہ کی گر کروں تحریر
تنگ ہو عرصہ نقوش و سطور

ترکِ عشقِ بتاں کریں عشاق
مجھ سے سن پائیں گر ستائشِ حور

گر کروں ذکرِ لذتِ طاعات
تلخ کر دوں مذاقِ فسق و فجور

چھینر دوں گر فسانہ فرہاد
دل خسرو میں ڈال دوں ناسور

کرنے جاؤں جو حق سے عذرِ گناہ
لے کے آؤں نویدِ عفوِ قصور

لوں ملائک سے دادِ حسنِ کلام
گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

وہ شہنشاہ امتی جس کا
یاں گنہگار اور وہاں مغفور

وہ خداوند خدمتی جس کا
یاں سبکسار اور وہاں ماجور

مژدہ اے امتِ ضعیف کہ یاں
سعی ہوتی ہے بے کیے مشکور

لبِ شیریں کلام سے اس کے
دوست بھی شاد غیر بھی مسرور

اثرِ فیضِ عام سے اس کے
کعبہ آباد و مے کدہ معمور

چرخ کو دے اگر وہ حکم سکوں
ہو غلط نسخہ سنین و شہور

صرصر قہر گر چلے اس کی
بند ہو مسلکِ صبا و دیور

جس طرف ہو وہ گرمِ نظارہ
جلوہ گر ہو ادھر سے لعدہ طور

ہو جہاں لطف سے وہ سایہِ قلن
موجزن ہو وہاں سے چشمہ نور

بات پوچھو تو سوئے چرخِ نگاہ
بینہ دیکھو تو علم کا گنجور

ہو سکے اس کی خوبیوں کا شمار
نعتیں حق کی ہوں اگر محصور

اے ترا پایہ فہم سے برتر
اے ترا نامِ عرش پر مسطور

میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں
نام تیرا شفیعِ روزِ نشور

کچھ نہیں زادِ راہِ پاس اپنے
مگر امیدِ عفوِ ربِّ غفور

طبعِ غالب ہے اور میں مغلوب
نفسِ قاہر ہے اور میں مقہور

بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق
نشہ کبر میں ہوں بالکل چور

چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن
ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

مہرِ فرزند و خواہشِ زر و سیم
طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور

ایک بیمار اور سو آزار
ایک پرنجور اور سو ناسور

نفسِ امارہ اور دیوِ مرید
یہ ہے افعی تو وہ ہے کلبِ عقور

مجھ سے جو کام چاہیے لیجے
جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور

حسد و بغض و غیبت و بہتان
بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور

ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی
ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور

دل لگے بندگی میں کیا امکان
لب ہلے ذکرِ حق میں کیا مذکور

مایۂ عقل ہے نہ شورِ جنوں
دلِ بے تاب ہے نہ جانِ صبور

نہ معاصی میں تلخیِ مخلصت
نہ عبادت میں چاشنیِ حضور

فی المثل ہے مری مسلمان
جیسے زنگی کا نام ہو کافور

ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے
تیرے زمرے میں گر ہوا محشور

جب ترے کارواں میں جا پہنچا
پھر رہا بابِ خلد کتنی دور

دوریِ آستانِ والا سے
ہے بہت تنگِ حالیِ مہجور

اب دعا یہ ہے اے شفیعِ ام
بسکہ بے تاب ہے دلِ رنجور

جا لگے تیرے در پہ کشتیِ عمر
جب کروں بحرِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

قصیدہ مدحیہ نامتمام

(نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کی شان میں)

ظہلِ حق کلبِ علی خاں جس کے بذل و جود پر
ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا

صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکام دیں
زائرِ قبرِ نبیؐ اور حاجیِ بیتِ الہدیٰ

شاعری میں فردِ موسیقی میں فارابیِ عصر
صوتِ روح افزا و صورتِ آیہِ صنعِ خدا

دولتِ برطانیہ پر اس کی فرزندگی کا حق
دولتِ عثمانیہ کو اس سے پیوندِ ولا

اس کی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس

اور مروت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا

مرجعِ اربابِ علم و فن ہے اس کا بابِ فیض

یہ وہ دعویٰ ہے کہ خود دربار ہے اس کا گوا

گلزمینِ ہند میں تھے جو درختِ بار دار

ان کو چن چن کر یہاں لایا چمن بندِ سخا

گر مناظر ہیں تو ہیں سر دفترِ اہلِ کلام

اور محدث ہیں تو ہیں سر چشمہٴ علم و ہدیٰ

زمرہٴ اہلِ یقین۔ یا مجمعِ اہلِ سلوک

نکتہٴ چینانِ مجبطنی خردہ گیرانِ شفا

شاعرِ شیریں نفس یا شاطرِ سنجیدہ رائے

فیلسوفِ متدل یا عارفِ علتِ ربا

بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اس باغ میں

بلبلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلا و دور دست

اے خوشا وہ سرزمین جس پر ہو تو فرماں روا

بارِ محصولات سے یاں تک ہوئی بلکی کہ اب

بارِ منت سے ترے پشتِ رعیت ہے دوتا

خیر تیری ہے حصارِ عافیت تیرے لیے

سیر ہو کر تجھ کو دیتے ہیں بہت بھوکے دعا

نعمتیں حق کی نہ سمٹیں گی سمیٹی زہنہار

ہر بھلائی کی ملی وہ چند گر تجھ کو جزا

خوانِ نعمت پر ہے تیرے مسہمانوں کا ہجوم

نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ کا

ہے یقین تجھ پر پڑے اصحابِ محشر کی نگاہ

جب کہیں کس نے کیا حق میزبانی کا ادا

دولت و اقبالِ روز افزوں سے تیرے ہے عیاں

جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا

پرورش پاتی تھی جن کے سایہ دولت میں قوم
لے گئی ان کو بہا کر موجِ سیلابِ فنا

کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر
ہند میں اب تکیہ گاہِ امتِ خیر الوریٰ

یہ اگر بنتے نہ کشتیاں اس طوفان میں
کشتیِ اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا

رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل
ورنہ ان کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا

مل گئے تھے گوہرِ درجِ شرافت خاک میں
خاک سے تو نے اٹھایا ان کو اور بخشی جلا

ہو رہے تھے دو دمانِ علم و دولت جاں بہ لب
تو نے ایک اک کے چوایا حلق میں آبِ بقل

کول میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم
آبِ یاری سے ہے تیری ہی اسے نشوونما

ہے یہ وہ احسان جس کے بارِ منت سے کبھی
قوم کی گردن نہ ہلکی ہوگی بے روے وریا

تیرے ظلِ تربیت میں گر رہا ہے یہ نونہال
ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اس کی طوہی سے سوا

فرض اگر کیجے اسے دیوارِ کاخِ آرزو
تو وہ پشتیاں ہے جس سے اس کی قائم ہے بنا

اور اگر کہیے کہ ہے یہ قوم کی کشتِ مراد
تو ہے اس پر ابرِ رحمت کی طرح چھایا ہوا

قصیدۂ ناتمام مرقومہ ۱۲۹۲ھ

(سر سید احمد خاں دام بقاؤ ہم کی شان میں)

پہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ ورنہ یاں سے کب کا نکل گیا ہے

اس پر بھی اے عزیزو ہے جائے فخر تم کو
دینوں میں دین بیضا حق نے تمہیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمہارا جو گھر ہے سب سے پہلا
ہادی ہے وہ تمہارا جو ختم انبیاء ہے

دی ہے وہ مصلح کل حق نے کتاب تم کو
جس نے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے

بخشی تمہیں حکومت حکمت تمہیں عطا کی
دوراں سدا موافق تم سے یونہی رہا ہے

اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرِ بزر چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی پر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر خدا ہے

درہم سے اور قلم سے دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اس نے وہ کس سے ہو سکا ہے

ہمدرد قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا
یہ درد اس کو جد کی میراث میں ملا ہے

تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چہرہ ہر سمت ہو رہا ہے

بعد از قرونِ اولیٰ کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۳ھ

(مرثیہ مہیں برادر راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم)

کل سوگ میں بھائی کے اسے دیکھ کے چپ چپ
حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحرِ معانی

خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا
کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی

شادی میں تری تہنیتیں ہم نے سنی ہیں
ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی

ہنسنا ہے نہ رونا ہے نہ بذلہ ہے نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی

دنیا ہے یہ اک دارِ فنا جس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی

ہو جائے گر انساں یونہی ہر رنج میں خاموش
کس طرح دلوں کے ہوں عیاں راز نہانی

اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے
دل بل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاصی و دانی

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی پھرتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا مر جانے کی ہے اس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
 سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
 جس بھائی کے سایہ میں کٹی اس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو
 دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی

جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
 لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی

دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو
 کیا ڈھونڈتے ہو اس کی طبیعت میں روانی

یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ
 یہ چپ نہیں مر جانے کی ہے دل کے نشانی

بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں
 یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لنگھانی

پر آہ کلی وہ جو ہے مر جھاگنی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۵ھ

(جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدارالمہام سرکارِ عالی)

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض
کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں

شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے
اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

نہ ہوئی مجھ سے کوئی خدمتِ سرکارِ نظام
نہ کیا میں نے کبھی طوفِ درِ صدرِ زماں

نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لایقِ قدر
اور نہ ایسا کوئی جو ہر جو ہو قیمت میں گراں

حق نہ تھا دولتِ عالی پہ کوئی حالی کا
جس کے جلدو میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں

ہاں مگر ذات میں ہے فیضِ رسائی جن کی
ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں

ہیں مرتبی ہنر و بے ہنری کے جس طرح
خار و گل دونو کو کرتا ہے نہال آبِ رواں

آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار
ملک میں اس کا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جوان

یہاں وہ ان کھیتیوں کو دے کے گیا ہے پانی
آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگران

قوم اس وقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج
ہے وہ عالم پہ ہویدا نہیں محتاجِ بیاں

عزتِ آسودگی اور ملت و مذہب ان کا
ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں

پھر نہ قدر انکی کچھ آنکھوں میں خلایق کی بلند
اور نہ وزن ان کا ترازو میں حکومت کی گراں

آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے
ورد کا جان لیا ان کے کہ یہ ہے درماں

مدرسے قوم کے اس ملک میں جو ہیں ممتاز
جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشاں

ان کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم
چشمِ عالم میں مسیحائی پہ اپنی بُرہاں

کرتے ہیں زندہ جاوید بنی نوع کو جو
بذل کرتے ہیں پئے تربیتِ اہلِ زماں

ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی جس کا
ملک پر قوم پہ تا دیر رہے گا احساں

یہی بخشش ہے یہی جود ہے اس الحسنات
جس پہ موقوف ہے بہبودی نسلِ انساں

یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز
یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں

یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف
یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں

دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل
کی ہمیشہ کے لیے ایک نے وہاں نہر رواں

اس کی خواہش تھی کہ ہوتے رہیں پیاسے سیراب
اس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں

برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں
نہرِ جاری سے ہے ذات ان کی ہوا فیض رساں

بخت اس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر
حاجی علم و خریدارِ کمالِ انساں

اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جب تک
شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احساں

آسماں جاہ سے ہو تقویتِ ملکِ دکن
اور رہے ملکِ دکن طبا و ماواے جہاں

دولتِ قیصری و دولتِ آصف جامی
ایک کی ایک زمانہ میں رہے پشتیبان

قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۶ھ

(تہنیتِ عید الفطر بہ جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدارالہما مہم سرکارِ عالی)

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا
خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا

کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
کہ اپنے صبر کا انعام ہم نے پھر پایا

رہین منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام
کہ تمیں روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوا یا

گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا

شگفتہ آتے ہیں اس طرح عید گاہ سے لوگ
کہ گنج انہوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا

حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج
کہ دن خدا نے نمائش کا ان کو دکھلایا

عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
 خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا
 حکیم ہیں مُتَفَكِّرٌ نہ زاہد افسردہ
 خوشی نے دی ہے زمانہ کی کچھ پلٹ کایا

غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کھال میں مست
 ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چکھوایا

ادھر ہے فصلِ بہار اور ادھر ہے عید الفطر
 سماں نشاط کا ہے شہر و دشت پر چھایا

کھلے ہیں اس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول
 جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہے کملایا

ہزاروں سرد خراماں ہیں شہر میں ہر سو
 جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مرجھایا

اگر خوشی کا زمانہ کی ہے یہی عالم
 تو سمجھو غم کا عوض غمزدوں نے بھر پایا

مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب ہیچ
اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اترایا

فریفتہ ہوئے جو ایسی ایسی خوشیوں پر
انہوں نے آب کا دھوکا سراب پر کھایا

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی ان کی
جنہوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا

جنہوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
جنہوں نے علم کا بجھتا چراغ اکسایا

جنہوں نے خلق سے اپنا بنایا غیروں کو
جنہوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا

خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم
کھلایا بھوکوں کو بے پوشیوں کو پہنایا

ہوا زمین پہ جس سال آسماں مسک
مینہ اپنی داد و دہش کا انہوں نے برسایا

ہوائے دہر اگر ہوگئی کبھی فاسد
فضائے دہر کو مطلقِ حَسَن سے مہکایا

سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار
لیا سنبھال اسے جس نے ہاتھ پکڑایا

ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا
نہ مانگ سکتے تھے جو ان کے گھر پہ پہنچایا

نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھ کر
انہوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا

نہ پائی کھانے میں لذت نہ چہین سے سوائے
ستمِ رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وغا میں شیرِ مگر وقتِ رحمِ مورِ ضعیف
کسی کی آہ سنی اور دل انکا بھر آیا

وہ کبھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج
جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا

وہ چونک اٹھے کہ گویا قیامت آ پہنچی
جو در پہ آ کے کوئی داد خواہ چلایا

نشاط و عشرتِ جاوید کی ہے ان کو نوید
دل ایسا جن کو عنایتِ خدا نے فرمایا

سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف
سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا

بشیرِ دولت و دیں صدرِ اعظمِ امرا
نہیں ہے جس کا کوئی قربِ شہ میں ہم پایہ

جو ظلِ حق ہے رعیت کے سر پہ شاہِ دکن
تو اعظمُ الامرا ظلِ حق کا ہے سایہ

ہمیشہ جس کو ہے بہبودِ ملک مدِ نظر
رفاہ و امن ممالک میں جس نے پھیلایا

اٹھایا فتنہ نے جب سرِ فرو کیا اس کو
پڑا عمل میں جہاں عقدہ اس کو سلجھایا

بنائے نظم و نسق جس نے رکھی شورئی پر
مشیرِ کارِ خرد پروروں کو ٹھیرایا

دکن کو جس نے کیا مرجعِ خواہش و عوام
دکن کا جس نے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا

نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرماں
جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا

بل انتظام کے رشتہ میں پڑ رہے تھے بہت
سو تکلے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا

لگا گئے تھے وزیرانِ رفتہ جو پودا
وہ صاحبی میں وزیرِ زماں کی پھل لایا

ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے بلدہ نے
کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہے شرمایا

زمانِ حال سے ماضی کو دیجئے کیا نسبت
اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا

خدا دراز کرے عمرِ اعظمِ الامرا
دکن کو جس کی حکومت نے دن یہ دکھلایا

زمین پہ سایہ فگن جب تک آسمان رہے
رہے دکن پہ حضورِ نظام کا سایہ

تھی کوئی چیز نہ حالی کے پاس لایقِ نذر
سو یہ چگمہ ناچیز پیشکش لایا

یہی بس اس کے لیے ہو گا مایہ نازش
جو اعظمِ الامرا نے قبول فرمایا

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۸ھ

تہنیتِ ولادتِ فرزندِ ارجمندِ شبستانِ اقبال جناب نواب سرآساں جاہ بہادر مدارالمہامہ سرکارِ عالی

فیضِ ربِّ ذوالہمن سے مرثدہ اے الٰہی دکن
نائبِ دولت کا نخلِ آرزو لایا ثمر

دی بشیرِ دولت و دیں کو وہ چیز اللہ نے
جس سے پایا دیدۂ یعقوب نے نورِ بصر

جس کو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہ نے
حق نے دی جس کے عطا ہونے کی سارا کو خبر

جس کے ملنے سے ہوا داؤد ممنونِ قضا
جس کے پانے سے ہوا ایوب مرہونِ قدر

جس کے بدلہ میں علیٰ الرِّغْمِ شامتِ پیشگاں
حق سے ختم الانبیاء نے پائے شبیر و شبر

جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی
جو ہے حاصلِ عمر کا اور زندگانی کا ثمر

جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز
جس سے ہیں اجداد زندہ اور اماجد نامور

صدرِ اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خلف
خلق کی۔ آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر

یہ سپر یا رب بحقِ عترتِ خیر الوری
پائے عمرِ خضر زیرِ سایہ مہرِ پدر

صدرِ اعظم کی طرح دربارِ آصف جاہ میں
جایگاہِ قربِ سلطانی ہو اس کا مُستقر

دولت و ثروت کو اس کی ذات سے لگ جائے شان
زیورِ علم و ادب سے ہو مجلیٰ اس قدر

سیرت و عادت میں اس کی نکلے آن اجداد کی
جوہرِ اخلاقِ فاروقی ہوں اس میں جلوہ گر

ملکِ آصف جاہ میں سرِ آسماں جاہ اور وہ
رات دن رکھیں اجالا صورتِ شمس و قمر

قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ

اے صفر کی دوسری روزِ دو شنبہ مرجبا
ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبحِ جانفزا

ہم نے رکھا آ کے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

عزتِ قومی ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے
اس کے کچھ آثار دیکھے ہم نے یاں شکرِ خدا

کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھا کسدت سے ہم
آ کے بلدہ کے سوانہ میں لگا اس کا پتا

بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے

جھولیاں ڈالے گلے میں در بدر دیتے صدا

پہنچے لینے ان کو وہ اعیان دار الملک سے

دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا

قوم کو ہے جن پہ فخر اور ملک کو ہے جن پہ ناز

سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قوی

صدرِ اعظم نے ہمیں بخشا اقامت کے لیے

وہ سرا بستیاں خجل ہو جس سے جنت کی فضا

ہم غریبوں کو سمجھ کر اک سفارت قوم کی

دی وہ عزت شکر جس کا ہو نہیں سکتا ادا

پیشتر مہماں نوازی کا فقط سنتے تھے نام

آ کے یاں سمجھے کہ ہے مہماں نوازی چیز کیا

کی ہے نواب اقتدار الملک نے جو مرحمت

اس نے کلفت کو ستر کی ہل سے بالکل دھو دیا

یہ مقولہ ہند میں مدت سے ہے ضرب المثل
جو کہ جا پہنچا دکن میں بس وہیں کا ہو رہا

ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری
جو دکن میں آ کے دیتی ہے وطن دل سے بھلا

وارثِ ملکِ دکن ہے آج وہ محبوبِ خلق
نام پر دیتا ہے جس کے جان ہر چھوٹا بڑا

ہم کہہ ہیں وکٹوریا کے مہدِ رافت میں پلے
اسن و آزادی کی ہم نے کھائی ہے برسوں ہوا

جاننے ہیں ہم کہ پلتی ہے رعیت کس طرح
کس طرح ہوتے ہیں مقبول جہاں فرماں روا

کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیرِ قلوب
کس طرح بوتے ہیں دل میں خلق کے عجم و فا

کبر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر
تو یہ سمجھو حقِ حکومت کا کیا اس نے ادا

ہے یہی شاہِ دکن کی گلہ بانی کی دلیل
گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا

پوچھنے گچھنے کی اہلِ ملک سے حاجت نہیں
ان کی خوشحالی پہ ان کی تازہ روئی ہے گوا

دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار
خلق کو سرسبز دیکھا آ کے یاں ان سے سوا

راہ میں دیکھے تھے ہم نے کوہِ اگر گردوں شکوہ
آ کے دارالملک میں دیکھے محلِ گردوں نما

عالموں کی سخت گیری سے ہیں سب آزاد یاں
بینوا سے منعم اور منعم سے بڑھ کر بے نوا

اغنیاء میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں
جیسا بے پروا نظر آتا ہے یاں ایک اک گدا

جتنی یاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول
بے تعصب بے تکلف بے تصنع بے ریا

ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک
ایک کی تقریب میں ہمد ہیں سب اور ہم نوا

دولتِ عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیئے
ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یاں دوسرا

پاری ہندو مسلمان یا مسیحی کوئی ہو
ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ہم کو یاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ
رہزور کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا

قصہ کوتاہ بار جب ہم کو ملا دربار میں
کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا

دیکھ کر اپنی رسائی تختِ آصف جاہ تک
واقعہ مور اور سلیمان کا ہمیں یاد آ گیا

حضرتِ والائے جس شفقت سے کیس نذریں قبول
اس پہ گرجاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہے بجا

جس توجہ سے سنی رودادِ قومی درسِ گاہ
شکر سے اس کے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برا

جب سے کالج کی علی گڑھ میں بنا ڈالی گئی
دولتِ عالی مدد کرتی رہی اس کی سدا

جو لگایا تھا درخت اس کی ہمیشہ لی خبر
دم بدم پانی دیا یاں تک کہ بار آور ہوا

اب کہ وقت آ کر پڑا تھا بانی کالج پہ سخت
دولتِ عالی نے شرطِ دستگیری کی ادا

مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اول بخل
کی اسی دریا دلی سے ان کی پھر حاجت روا

خود علی گڑھ کالج اور اس کے درو دیوار سب
راگ گائیں گے سدا احسانِ آصف جاہ کا

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تک اسلام کی
جیتے جی ہوں گی نہ اس کے طوقِ منت سے رہا

کی ہے سرسید نے جو کوششِ فلاحِ قوم میں
اس کو ہے اے اہلِ مجلسِ اک زمانہ جانتا

پہ نہ سرسید سے بیڑا پار ہوتا تھا محال
دولتِ عالی اگر بنتی نہ اس کی تاخدا

تھا پڑا سید کا سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز
دولتِ عالی نے اس خشکی میں گنگا دی بہا

ہے روایت جبکہ ہجرت کر کے ختم المرسلین
پہنچے یرن میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

جس طرح ہوتی ہے بانہی سانپ کی جائے پناہ
ہو گا طبا اب مدینہ بھی یونہی اسلام کا

ہے بلاشبہ دارالملك آصف جاہ بھی
ہند میں اب مرکزِ اسلام بے رووریا

ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستان میں انتخاب
دولتِ عالی نے جن جن کر لیا سب کو بلا

تربتیں اور خانقاہیں مدرسے اور مسجدیں
سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون و چرا

حج بیت اللہ سے جوہر مسلمان پر ہے فرض
ہے دکن آنا مقدم شک نہیں اس میں ذرا

اول آنا چاہئے یا استطاعت کے لیے
کیونکہ ہے بے استطاعت حج کو جانا ناروا

خرچ سے ہاتھ اک مسلمان کا ہو گرا تر میں تنگ
ہے دکن کی سمت وہ گردن اٹھا کر دیکھتا

خواب آتے ہیں دکن کے اس کو سوتے میں نظر
قوم کا بچہ ٹل سے جب ذرا آگے بڑھا

ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں
اور مدد کو جن کی وہاں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا

چلتے چلتے ان کی گاڑی بھی اٹک جاتی ہے جب
کھینچنے کو اس کے جاتا ہے یہیں سے بینڈیا

ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یارو وہ مثال
اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں بپا
تھا جہاز اک اس میں معمور اہل فضل و جاہ سے
لطمہ امواج نے پرزے دیئے اس کے اڑا

ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اچھلے نہ پھر
نچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست و پا

کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں ان کو نظر
اس محیط بے کراں میں ایک زورق کے سوا

ہے وہ زورق فی المثل سرکارِ آصف جاہ کی
ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جس کا آسرا

ہے دعا جس وقت تک پانی سمندر میں رہے
یارب اس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا

ختم کر حالی سپاہِ صدرِ اعظم پر سخن
بال بال اپنا ہے جس کے شکر میں جکڑا ہوا

تقویت سے جس کی ہر مشکل ہماری حل ہوئی
انجمن کے منعقد ہونے کی دی جس نے رضا

پھر ادا کر جان و دل سے شکر صدرِ انجمن
جس کے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا

جس نے قومی انجمن میں بن کے صدرِ انجمن
قوم کو دی عزت اور انکی امیدیں دیں بڑھا

لے کے اذنِ صدرِ مجلس کیجیے پھر قصدِ وطن
ورنہ ہے حالی دکن کی دل فریب آب و ہوا

باندھ لیجے جلد اب رختِ سفر ڈر ہے کہ ساتھ
قافلہ سے چھٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ

(بمقام حیدرآباد دکن)

یاں بلا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے
اول اس کا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں

خدمتِ والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہے
عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں

شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال امانے دہر
جو لیاقت اس میں ہے درکار وہ ہم میں نہیں

شکر کرنا تھا ہمیں سرکارِ عالی کا ضرور
چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہم نے پڑھیں

گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت
اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں

رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک تصور
درگزر فرمائیں گے سرکار اس سے ہے یقین

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ بمقام حیدرآباد دکن

(در شکر اضافہ و وظیفہ بہ پیش گاہ جناب نواب سرآساں جاہ بہادر)

اے بشیرِ دولت و دینِ نایبِ شاہِ دکن
اے مہماتِ دکن کا ذات پر تیری مدار

مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زہنہار

جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے
پہلے ہو لیتے ہیں صد ہا مشکلوں سے وہ دوچار

کوئی دنیا میں نہیں ہوتی بغیر اس کے فتوح
ہے اسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار

پر ملا مقصود جب حالی کو اس در سے ملا
بے تردد، بے تذلل، بے طلب، بے انتظار

قدر دانی گر زمانہ میں یونہی ہو جائے عام
پائیں بے مانگے مرادیں اپنی سب امیدوار

یارب اس سرکار کو ہے جس سے عالم فیضیاب
جب تلک دنیا رہے دنیا میں رکھو برقرار

ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۱ء مطابق ۱۳۰۹ھ
(جو محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا)

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیونکر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

جب ہوئے بھوکے تو بخششی تو نے نان و ناں خورش
پر نہ اتنی معدہ و احشا پہ جو گزرے گراں

جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک
پر نہ ایسا ہو صراحی جس کی یاروں سے نہاں

ڈھانکنا چاہا بدن جب تو دیا تو نے لباس
پر نہ ایسا جس کو حسرت سے نکلیں خرد و کلاں

کھانے پینے کو کیے برتن ہمیں تو نے عطا
پر نہ ایسے ٹوٹنے سے جن کے ہو خوف زیاں

سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں
پر نہ ایسا جس سے اٹھنا ہو طبیعت پر گراں

رہنے سہنے کو دیئے گھر تو نے ہم کو ہر جگہ
پر نہ ایسے ہو تعلق جن سے مثلِ جسم و جاں

آٹے جانے کو دیئے دو پانویاں تو نے ہمیں
جن سے ڈرنے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں

راہ اور بے راہ یکساں جن کو ہنگامِ خرام
کوہ سدرِ راہ جن کا اور نہ خندق اور کواں

کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر
پر نہ ایسی تختِ فرعونی کا ہو جس پر گماں

سیم و زر وقتِ ضرورت ہم کو تو دیتا رہا
پر نہ اتنا ہو نگہبانی میں جس کی بیم جاں

آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز
پر نہ ایسی جس سے ہوں محسوداً بنائے زماں

نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں
تا کہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہم پر عیاں

راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد
تا کہ کھو بیٹھیں نہ ہم ان راحتوں کو رایگاں

وقت پر کرتا رہا بارانِ رحمت سے نہال
قحط اور طوفانِ دونو سے بچایا بال بال



الحذر اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
لومڑی جاتے ہیں بن جس کی بدولت شیریز

چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیہ
ناکسوں کے نازِ بے جا سہتے ہیں اہلِ ہنر

وزن میں علم و فضیلت جن کے ہے ہم سنگِ کوہ
وہ سبک تر دانہ خردل سے آتے ہیں نظر

فقر و حاجت میں نہ ہو انساں کو جب صبر و تکلیب
پھر نہیں کوئی برائی فقر و حاجت سے تر

بھیک منگوائے، جو اُکھلوائے، یہ چوری کرائے
پت گنوائے، آبرو کھوئے، پھرائے در بدر

ہو سکے محتاج سے طاعت زیاد اللہ کی
لے سکے محتاج جو رو کی نہ بچوں کی خبر

کہ زباں آلودہ اس کی شکوۂ تقدیر سے
اور کبھی بوچھاڑ اس کی آسمانِ پیر پر

گر بخیلوں کی مذمت پر کبھی آ جائے وہ
ہو نہ سب دشمن سے سیری اسے دو دو پہر

اگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ
کھول دے غیبت کا دفتر اہلِ دولت کی اگر

کہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے
تا کہ دولت مند بھی کچھ دن رہیں آسیدہ گر

اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب
تا کہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر

بے حلاوت اس کی دنیا اور مذہب اس کا دیں
خونناک اس کا ارادہ نیت اس کی پُر خطر

رات اس کی حسرت آگیں اور دن اندوہ گیں
شام اس کی پُر نحوست اور شوم اس کی سحر

گو کہ بدتر فقر سے یا رب نہ تھی کوئی بلا
تھا مگر ثروت میں اس سے بھی زیادہ شور و شر

فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت جو اس کے شکر کی طاقت نہیں



نشہٴ دولت کا تھا پھر ہوش میں آنا محال
اس مئے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال

نفسِ امارہ اور اس پر چھیڑ مال و جاہ کی
ڈھیر ہے بارود کا دیجے پتنگا جس میں ڈال

بادِ صرصر آگ کو اس طرح بھڑکاتی نہیں
جس طرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال

ہضم کرنا اور پہچانا مال و دولت کا ہے بس
نفسِ انساں میں اگر بالفرض ہے کوئی کمال

ورنہ مال و جاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم
 اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال
 عقل ٹھیراتی ہے جو افعال انساں پر حرام
 کر دیے ان کے لیے سب مال و دولت نے حلال
 فقہر میں تھا نفسِ دوں و اماندہ جس پرواز سے
 آ کے ثروت نے دیے پروا سطلے اس کے نکال
 خواہشیں یوں نفس میں اب دمبدم بڑھنے لگیں
 مغز میں جس طرح دیوانہ کے گونا گوں خیال
 آپکو گننے لگا بالاتر از ابنائے جنس
 چیونٹوں میں ایک نے گویا نکالے پر و بال
 مسرف بے زر ہو جیسے قرض خواہوں میں گھرا
 خواہشوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے بال بال
 جھک پڑی طبعِ دنی گر بخل و خست کی طرف
 ہو گئی فرزند و زن پر زندگی اس کی وبال

اور اگر بھوت اس کے سر پر چڑھ گیا اسراف کا
پھر نہیں گنجینہٴ قاروں کچھ آگے اسکے مال

آ گیا غالب طبیعت پر گر استقائے حرص
ہے سمندر سے بھی اس کی پیاس کا بھجنا محال

باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اس قدر
جس قدر ثروت میں ہے دشوار پاسِ اعتدال

کلشنِ دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر
دیکھ اے روباہِ نفسِ دوں حذر ان سے حذر



ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنہ سے بری

چین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہے
یہ جو ہے برزخ میانِ ممکنت و دست تہی

فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ اور جنت اگر
مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی

دخل شیطان کا ہو جس میں ایسی جنت کو سلام
منزلِ اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

اس کٹھن منزل میں ہے بیٹا یہی اک بے خطر
ہیں ادھر کھڈ اور چڑھائی ہے ادھر البرز کی

رکتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین
ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مہلک سے بری

اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک
دیکھ کر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل وہی

سن کے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و ناز
مل کے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر خنا کبھی

لذتِ فقر و غنا دونو سے ہیں وہ آشنا
اغنیاء میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی

جو گزرتی ہے گدا پر اس سے ہیں وہ باخبر
کیونکہ حالت گاہ گاہ ان پر بھی گزری ہے یہی

امتحانِ دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے
کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بد مستی وہی

اس لیے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابنائے جنس
جوشِ ہمدردی سے بے کل ان کا ہو جاتا ہے جی

اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا
جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی از خود رنگی

مست کی بے اختیاری تشنگی مخمور کی
واردات ایک ایک کی ہے سر بسر ان پر کھلی

جنت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر
گندم اور زقوم دونو ان کے ہیں پیشِ نظر



دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت ان سے ہے
منتظم ہر قوم و ملت کی جماعت ان سے ہے

مشکلیں اکثر انہیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل
بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت ان سے ہے

ہے انہیں کے دم سے جو ہے گرمی ہنگامہ آج
ساری قومی مجلسوں کی زیب و زینت ان سے ہے

ہے جہاں دولت یہی ہیں نظم و دولت کے کفیل
ملک کی دولت میں ہے جو خیر و برکت ان سے ہے

ہاتھ میں ان کے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام
عقل و دانش میں ہے جن ملکوں کی شہرت ان سے ہے

ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر
شاہ ہوں یا ہوں گدا دونو کو قوت ان سے ہے

آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے
نوعِ انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے

یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں
رونقِ بازار جنسِ علم و حکمت ان سے ہے

پاؤ گے ان میں طبیب ان میں ادیب ان میں خطیب
ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے

پاؤ گے ان میں مہندس پاؤ گے ان میں حکیم
آدمی مصداقِ رحمانی خلافت ان سے ہے

کرتے ہیں اخلاقِ ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے

ان میں قوموں کے ہیں مصلح ان میں ملکوں کے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت ان سے ہے

پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قوموں میں یکرنگی و وحدت ان سے ہے

دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام



گر نہ ہو ہر حال میں ان کی مصالِح پر نظر
ہیں مفاسد گرد و پیش ان کے فراہم سر بسر

کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں
ہے انہیں بھی شر سے یاں بیچ بیچ کے رہنا عمر بھر

گھاٹیاں فقر و غنا کی ان کے ہیں دونو طرف
اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر

ایک جانب پستیِ فطرت ہے اور دوں ہمتی
ایک جانب مستی و غفلت ہے اور کبر و بطر

جھک پڑے گر اس طرف تو مفت کھو بیٹھے انہیں
وہ جواڑنے کے لیے حق نے دیئے تھے بال و پر

ڈھل گئے گر اس طرف تو اس بلا میں پھنس گئے
جس میں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر

برکتیں اللہ کی اس قوم پر جس قوم میں
رہ سپر یہ طبقہ والا ہو سیدھی راہ پر

ہیں معطل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست
سب کی پڑتی ہے انہیں کے دست و بازو پر نظر

جو قویٰ ان کو ملے ہیں کام میں لائیں انہیں
تا کہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی سر

فرض ہیں جو ان کے ذمہ خالق اور مخلوق کے
ان میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آنکھوں پہر

قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اسے
کیونکہ اس کے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر

گو نجات انساں کو مکروہاتِ دنیا سے نہیں
جن سے بچنا گوشت سے ناخن چھٹانا ہے مگر

کام دنیا میں سنوارے ہیں جنہوں نے قوم کے
تھے نکموں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر

سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے کام
اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر

جس طرح اس انجمن کے رکن آئے ہیں تمام
قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام



قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جان آتی ہے مردوں میں وہ طاقت ہے یہی

اتفاقِ قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل
رائی کو کرتی ہے جو پر بت وہ قوت ہے یہی

مال و دولت نامبارک ہے نہ ہو گر اتفاق
قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی

یاں وکیل ایک اک ہے شہر اور ملک کا قائم مقام
دانہ کو کرتی ہے جو خرمن وہ برکت ہے یہی

رایگاں جائے گا یاروں کا نہ یہ رنجِ سفر
راحتیں جس کی طفیلی ہیں وہ زحمت ہے یہی

فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں یاں سے مجتمع
ملتے ہیں جس کی بدولت دل وہ ملت ہے یہی

تم ہمارے کام آؤ ہم تمہارے آئیں کام
جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی

قوم کی خدمت میں ہے مضمحل رُبوبیت کی شاں
جو کہ پجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز
ملک میں عزت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی

سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار
جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی

کر رہا ہے قوم کے سرکل کو یہ مجمع وسیع
جزر سے افزوں ہے مد جس کا وہ رجعت ہے یہی

اتفاقاً گر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد
ڈر نہیں اس کا کہ خود قانونِ قدرت ہے یہی

ہے کبھی افراطِ باراں اور کبھی ہے قحطِ آب
طینتِ عالم میں خاصیت و دیت ہے یہی

کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس
جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلت ہے یہی

دیگ تو پکتے ہی یہ پکے گی دھیمی آنچ میں
کچھ ابال آیا تو ہے اس میں غنیمت ہے یہی

انجمن ہے قوم کی ہنگامہ شادی نہیں
ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

مسدس مرتبہ ۱۳۱۰ھ

(مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی)

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم

تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علم دیں
جیسے اُمّی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں جو تھا محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں
تھی محدث خیز اے پا تخت تیری سر زمیں

تھا تَفَقُّہ بھی مَسَلَم تیری خاکِ پاک کا
بیہتیِ وقت تھا ایک اک فقیہ اس خاک کا

شاذو نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر
آبِ دَکَل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر

تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہرِ منیر
تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر

آج جس دولت کا بازارِ جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے

رِطَب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم

جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے رِطَبِ یونانی ہوئی
شہرِ شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

خاک سے اٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ و
 اک جہاں شیوا بیانی سے ہے ان کی با خبر
 راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
 سرو کو ہو گی نہ راس اتنی ہوائے غافر

حسنِ صورت میں اگر ضربُ المثل نوشاد تھا
 حسنِ معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
 جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
 کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
 تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
 تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہورِ اَنام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام۔

شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں

طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے آ کر جو کہ تجھ میں چند سال

ذہل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات اور خصال

آ کے بن جاتا تھا یاں نقصانِ انساں کا کمال

تیرے پر چھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال

آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں

چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب

آن کر لیتے تھے یاں ٹھیک جہاں کے انتخاب

بتے تھے اطراف سے آ آ کے تجھ میں شیخ و شاب

کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبعِ دوراں کا ہے جیسے اقتضا
ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا

جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا
وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا

گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچِ آخر لگی کرنے بہار

تجھ پہ اے دارِ الخلافت انقلاب آنے لگے
غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے

طالعِ مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے
تیرہ بختی کے نظرِ یاروں کو خواب آنے لگے

دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دارالعلوم اٹھنے لگا علم و ہنر

ہو گئے تیرے محدثِ راہی دارالسلام
 کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام

ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام
 رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام

مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے
 خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے

چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
 مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب

جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
 اس گلستاں سے نہ انھی پھر صدائے عندلیب

جن کو کھو بیٹھے نظیر ان کا کہیں پایا نہ پھر
 جو گیا اسکا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

کر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سزا
 گر گیا نظر۔ سے تیرا سب جلال و جاہ و فر

جھڑ گئے تاجِ شرف سے تیرے سب لعل و گہر
تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر

علم ہے باقی نہ اب دولت ہے تیرے پاس وہ
اے گلِ پژمرده تیری کیا ہوئی بو باس وہ

دورِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا
بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا

خاک نے یاں تیری پھر اگلے وہ لعلِ بے بہا
جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نامِ اسلاف کا

عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنّت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی
پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتاہی

اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی
پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویرِ دورِ اکبری

علمِ دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
 ذال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں دھوم

ملک میں ہر سو وہی پھر بول بلا تھا ترا
 تھا جہاں علم و ہنر گودوں کا پالا تھا ترا

تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اجالا تھا ترا
 پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا

چاند نکلا تھا کہن سے جو وہ پھر گہنا گیا
 چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے
 واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے

کچھ سخن ور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
 کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیئے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری نوئی ناؤ کا
 لے گئی سیلِ فنا اسکو بھی اے دلی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گواہ شہرِ عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی

پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی بت قوم کی
اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

تجھ میں ہے دلی! کوئی اب ایسا مقبولِ جہاں؟
نازشِ دارالخلافتِ مرجعِ ہندوستان

ہند سے لے تا عرب کشمیر سے تا انڈیا
بچہ بچہ کی زباں پر نام ہے جس کارواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں
واقعاتِ زندگی کر دیجئے گر اس کے بیاں

سمجھیں اک افسانہ ناواقف اسے اور داستاں
ہے تعجب خیز الحق سیرتِ محمودِ خاں

یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہرِ انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جوہرِ کان سے

اس کا تھا دیوانِ خانہ ملک کا درالشا
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا

مفت بیماریوں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانہ کا تھا ان کو نہ شکرانہ کا تھا

اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سرِ مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھلُ مزدور کا

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا
تھے برابر اسکے نزدیک انجیا اور بے نوا

گو ظہیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا
کوئی مفلس کا نہ تھا پرسانِ حال اس کے سوا

کرتے ہیں جو دعوے ہمدردیِ نوعِ بشر
 اس نے باطل کر دیے تھے ان کے دعوے سر بسر
 طب مسلمانوں کی لای اس کی مسیحائی نے تمام
 ورنہ اب تک اس کی ترکی ہو چکی ہوتی تمام
 رونقِ طب جدید اور اس پہ میلِ خاص و عام
 درس گاہوں اور دوا خانوں کا اس کے انتظام
 دیکھ کر تھا اک زمانہ اس کی خوبی کا مقرر
 طب یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر
 سرجنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال و جیل
 آ گیا تھا رے میں زود اعتقادوں کی خلل
 دیں مگر اس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل
 طب یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل
 سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
 ایک طاقت اس کے حملوں سے ہوئی عہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب
پر الجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب

خلق کا پھر بجاو ماویٰ اسی کا تھا مطب
اس کے بیماروں کو گو مایوس ہوں یا جاں بلب

سوہ تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جس قدر
کرتے ہیں معلوم جو جو ان سے امراضِ بشر

وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے انگلی نبض پر
اس کی اک انگلی پہ تھے قربان سو تھرمانر

نارسا قہیں دور بنیں اہلِ صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہِ دور میں اس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن پیر و جوان خرد و کلاں
تھے قوی پشت اس سے ایسے جیسے پشتہ سے مکاں

جس کو نسخہ دے دیا لکھ کر وہ یہ سمجھا کہ ہاں
 زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یاں
 گو کہ ماتم ملک میں ہے اس کا ہر سو آج کل
 پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل
 کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب اور چارہ گر
 جو کہ تشخیصِ مرض میں رکھتے ہوں غائرِ نظر
 خلق کو تکیہ ہو جن کی رائے اور تدبیر پر
 شہر میں ہوں مرجعِ کل ملک میں ہوں نامور
 جمع ہوں محمود خاں کے ذات میں ان کی کمال
 ہے یہ سب ممکن مگر محمود خاں ملنا محال
 راستی اور راست بازی اس کی تھی ضربِ المثل
 اس کے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل
 امتحاں کے وقت جب تھا نظمِ عالم میں خلل
 راست بازوں کی گئی تھی ٹھیک جب ہر سو نکل

کھوٹ سے اس آنچ میں نکلا وہ خالص اس طرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کندن جس طرح

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بپا
نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا

اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا بتلا
باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موج زن تھا جبکہ دریائے عتابِ ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار
ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دو چار

یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرم سار
شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلے سے کہیں سب خشک وتر

ہو رہا تھا جب کہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں
 کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پتلا عیاں
 ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کواں
 بال سے بازیک تر تھی راہ ان کے درمیاں
 راہرو دگدا میں تھے اور راہ پر خوف و خطر
 اس نے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر
 مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ
 عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
 مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ
 پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ
 ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اس نے کی
 اہل انصاف اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی
 بایقین جن ملزموں کو اس نے سمجھا بے خطا
 مارشل لا میں ثبوت ان کی صفائی کا دیا

چہین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا
جو کہ تھے نادار کی ان کی اعانت بر ملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی خو جس کی نہ تھی
دی گواہی جس نے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی

جس نے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی
ہاتھ سے جس نے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی

بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پانو ایک اس کا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جبکہ عنقا تھی دیانت بینِ ابناء الزماں
تھی امانت جس کی اس کے پاس ہلکی یا گراں

خوف میں پاس اپنے رکھا اس کو مثلِ پاسباں
کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں

ایک عالم ناخدا ترسی میں جب بے باک تھا
اس کا دامن تھا کہ ہر دھبے سے بالکل پاک تھا

وضع داری میں نہ تھا اس کا زمانہ میں بدل
وضع میں اس کی تغیر تھا نہ عادت میں خلل

وقت کی تاثیر کا اس پر نہ چلتا تھا عمل
انقلابِ دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل

اس کے آگے ان نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اس پہ چلتی کچھ زمانہ کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرزِ زندگی اختیار
اس میں فرق آیا نہ وقتِ واپس تک زینہار

کوہِ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار
وضع اس کی جو کہ تھی وضعِ سلف کی یادگار

قوم کے از یادِ رفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہدِ عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علائق کا تھا گو بارگراں
پر ہر اک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں

پا بگل دنیا میں پر دنیا کے غم سے برکراں
رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شادماں

ظاہراً پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا
دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اہل اللہ کا

منقبض اس کو نہ مکروہات میں پایا کبھی
غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی

دل کسی بارِ مخالف سے نہ کملایا کبھی
تلخگیِ دوراں سے چتون پر نہ میل آیا کبھی

کی بسر دارِ الحسن میں بزمِ عشرت کی طرح
عمر کافی دوزخِ دنیا میں جنت کی طرح

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار

گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب باہر بہار
رنگ ہو گا جن میں لیکن بو نہ ہو گی زینہار

کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظر انجام پر
قوم میں اک ہم کو سناٹا سا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار
اہل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار

ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہوں گے کشت زار
جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار

مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یاں
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یاں

یا یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبتِ قحط الرجال
ایک اٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال

دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اس کی مثال
ذاتِ باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے ہمال

ظاہراً اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سننے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی

داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
کہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹونا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ

(جو محمد ان ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا)

یہ خاک آج جس پر ہیں جمع اہل آرا
یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا

اس باغ میں بہاریں جو جو گزر چکی ہیں
آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا

کل جشن فتح تھایاں ہے آج جشنِ شادی
ہر دم عروج پر ہے اسلام کا ستارا

بلبن کے آج مہماں خاقاں ہیں اور سلاطین
اصطخر ہے کہ دلی بلبن ہے یا کہ دارا

فیروز شاہ کی ہے کل ٹھننے سے آمد آمد

دولہا بنا ہوا ہے تڑپیں سے شہر سارا

تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل

بہرِ مدافعت ہے میدان میں صفِ آرا

مغلوں کے اڑ رہے ہیں کل جشنِ فتح و نصرت

تیمور سے زمانہ ہے برسرِ مدارا

آتا ہے آج بابر لودھی پہ فتحِ پا کر

ہیں شوقِ شاہِ نو میں پیرو جواں خود آرا

کل سُوریوں میں ہر سو بکتے ہیں شادیاں

مغلوں کا آ رہا ہے گردش میں کچھ ستارا

ہے جشنِ فتحِ پھر آج چغتائیوں میں برپا

اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قول ہارا

جس دھوم سے ہے گھر گھر جشنِ جلوسِ اکبر

ہے گرد اس کے آگے جشنِ قباد و دارا

شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا
تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارہ

طیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے
گو یا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدہ دوبارا

اطرافِ ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے
پا کر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا

ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر
بالائے تختِ طاؤس ہے شاہِ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن ان کے اب تک سب زیبِ داستاں ہیں



اے خاکِ پاکِ دہلی اے تختِ گاہِ شاہاں
پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں

ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سو
پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یاں

تقریبِ جشنِ جس میں ہو کچھ نہ جزِ اخوت
ملکوں سے جمع آ کر جس میں ہوئے ہوں اخواں

پائین و صدر کا ہو جس میں نہ کچھ تفاوت
خرد و بزرگ کی ہو جس میں نشست یکساں

جن کو نہ ہو بلاوا حاکم کا اور نہ قدغن
 لایا ہو کھینچ کر دل ان کو نہ حکمِ سلطان
 خادم ہوں جس قدر وہاں مخدوم قوم کے ہوں
 مخدوم جتنے ہوں وہاں سب قوم پر ہوں قرباں
 خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ وہاں تواضع
 ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں
 ٹھیرائیں جس کو چاہیں وہ آپ میرِ مجلس
 چاہیں جنہیں بنائیں وہ آپ میرِ ساماں
 آئے ہوں اس غرض سے سب مل کے تاکہ سوچیں
 دنیا میں کس طرح ہوں سرسبز پھر مسلمان
 ہندوستان میں کیونکر باقی رہے نشانی
 اس قوم کی کہ تھا کل جن کے وہ زیرِ فرماں
 نکلیں تو کیونکہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے
 اعزاز نے تھا باندھا جن کے بڑوں سے پیماں

ان مدرسوں کا کیونکر جاری رہے افاضہ
جن کے سبب ہے زندہ نامِ حدیث و قرآن

جو مسجدیں ہیں بہرِ ذکرِ خدائے واحد
مخفوظ حادثوں سے کیونکر ہوں ان کے ارکان

جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر پر
اپنی طرف سے لیکن ہے سعیِ فرضِ انساں

اے شہِ نشینِ اسلام اے معدنِ سلاطین
اے پائے تختِ سادات اے دارِ ملکِ مغلاں

تو جشنِ گاہِ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشنِ کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے



شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے
شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے

دولت کے تھے وہ جلوے ملت کا ہے یہ نقشہ
کاغذ کی تھی وہ ناویں بیڑا یہ نوح کا ہے

بے روح تھے وہ قالب ہے اس میں روح خویشی
موجِ سراب تھے وہ یہ چشمہ بقا ہے

میلے نہ وہ بچھڑتے روح ان میں گر یہ ہوتی
رہتا ہے آندھیوں میں روشن یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر
 اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے
 بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا
 یہ چھت نہ سمجھو سر پر یہ سایہ ہما ہے

گم گشتہ بخت جس کو پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہم
 لگتا ہے کچھ تو اس کا لگتا یہیں پتا ہے

وہ مشکلیں کریں گے اب حل ہمیں تمہیں کچھ
 جن مشکلوں کا ہم کو اور تم کو سامنا ہے

ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے
 معذور ہیں وہ ان سے شکوہ نہ کچھ گلا ہے

فوجِ کک کو اکثر سمجھا ہے فوجِ دشمن
 حملہ کبک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے

نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہوا ہے جب دن
 انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے

قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہم کو
اب تک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہے جان پر جب
لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بے خبر ہیں
پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو مدہا ہے

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنتے ہیں ناخدا پر روتا ہے ناخدا جب



گلشن میں فصلِ گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چین سے عنادِ گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھناسی
بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے ہیں یا جوان ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں

فضل و کمال ان کے کچھ تم میں ہوں تو جانیں
 گریہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
 کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
 کچھ کر۔ لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
 تم سے تھے تو تھا موعزت کو قوم کی کچھ
 اپنے تو قافلے سب پادر رکاب یاں ہیں
 اک خضرِ رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
 رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں
 خدمت میں بہان کی حالی کہتا ہے یہ ادب سے
 اس وقت رونق افزا یاں جتنے مہرباں ہیں
 دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
 ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں
 عرصہ ہوا کہ ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں
 قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

گھڑیاں اور مگرچھ ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو وگرنہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گننام و بے نشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روزِ بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹنہ جائیں

اشعار متفرقہ

ان میں اکثر وہ اشعار ہیں جو لوگوں کی فرمائش سے خاص خاص موقعوں پر اردو یا فارسی وغیرہ میں لکھے گئے ہیں

تمہید رقعہ شادی عروسی

شکر کیجئے کون سی نعمت کا خالق کی ادا

ایک سے ہے ایک نعمت اس کی بندوں پر سوا

اسکی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی

جس نے جو مانگا وہی اس نے مہیا کر دیا

نخل تر کو پھل دیا اور پھل کو بخشا رنگ و بو

سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب اور ضیا

کھیتیوں کو مینہ دیا ماں باپ کو اولاد دی
اس سے دی دنیا کو رونق اس سے آنکھوں کو جلا

عمر روز افزوں عطا فرمائی پھر اولاد کو
کل چھٹی تھی جن کی ہے دن آج ان کے بیاہ کا

آؤ اس کے شکر میں سب مل کے باہم شاد ہوں
تا کہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعامِ خدا

ایضاً

چھٹی۔ بیاہ یا تیج تہوار ہو
لبِ آب یا صحنِ گلزار ہو

گل و لالہ ہو یا ہو عطر و گلاب
مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب

یہ سارے خوشی کے ہیں سامان جب
کہ ہوں ایک جا جمع احباب سب

بزرگوں سے محفل کی شوکت بڑھے
عزیز اور پیاروں سے عزت بڑھے

جہاں اس طرح جمع ہوں چار یار
ہیں اس بزم پر لاکھ گلشنِ نثار

ایضاً

شکر که از فضلِ خدائے جہاں
وقت خوش از پرده بر آمد عیاں

شادیِ دل را سبب آمد بدست
فرصتِ بزمِ طرب آمد بدست

تا شود از مقدمِ اهلِ کرم
کلبهٔ ما غیرتِ باغِ ارم

ایضاً

رفت آسبِ زمستان بادِ نوروزی وزید
دوستان را با بشارتِ بادِ یارانِ رانوید

طرحِ بزمِ خرمی با هم دگر باید نهاد
نغمهٔ شکرِ الهی دم بدم باید کشید

ايضاً

سَلامٌ من مُحِبِّ مُسْتَكِينٍ
يُليهِ الخَيْرُ وَالْبُرُكَاتُ تُتْرَى

سَلامٌ رِدْفُهُ رُوحٌ وَرَاحٌ
وَبَيْنَ يَدَيْهِ لِالْأَحْبَابِ بُشْرَى

وَدَعْوَةٌ شَاهِدِينَ وَغَائِبِينَ
مِنَ الْإِخْوَانِ وَالنَّحْلَانِ طُرّاً

خاتمة رقعة شادي

فَاطِمَةُ الْعَيْشِ فِي الدُّنْيَا وَارْغَدَةُ
رَهِينَةُ بَزِيَّاتِ الْأَحْبَاءِ

ایضاً

ہزار دیدہ و دل فرسِ راہِ یارانے
کہ از مسرتِ یارانِ مسرت اندوزند

بہ شادی و طربِ ہمدگر شوند انبار
ہزار رخ ز فروغِ دلے بر افروزند

ایضاً

کارِ احبابِ ساختن بتوان
دوستاں را نو آختن بتوان

تا بہ دہر ابر و باد خواہد ماند
از شما لطف یاد خواہد ماند

اشعار غزل نا تمام



اس زندگی کے ہاتھوں چین ایک دن نہ پایا
یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں

حاضر ہو جب نہ دل ہی ہے باغ و راغ یکساں
ہم دوستو گئے بھی تو کیا گئے چمن میں

ہے اک خراش دل میں ڈر ہے کہ بھر نہ آئے
زخمی ہے قیرواں میں اور مشک ہے ختن میں

تو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوئی ہے ورنہ
اے فاختہ دھرا ہے کیا سرو و نارون میں

ایضاً

کس قدر یارو ہوا ہے انقلاب
آ گیا یاروں کے اقراروں میں فرق

خود بتا دے گا تمہیں دورِ زماں
بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق

ان پہ ہم قرباں ہیں وہ ہم پر نثار
ہے بہت پیاروں میں اور یاروں میں فرق

ایضاً

گر نہ ہو نیتِ گدا میں فرق
آئے کیوں شاہ کی عطا میں فرق

ہیں وفادار اور بھی لیکن
ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

اشعارِ قصیدہٴ ناتمام

یادِ ایام کہ تھی باغِ جوانی پہ بہار
نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار

نشہ میں چور تھے اک بادۂ پر زور کے ہم
جس کا راحت میں نہ کلفت میں اترتا تھا خمار

سر پہ وہ دیو قوی آ کے چڑھا تھا اپنے
یاد تھا جس کا نہ عامل کو نہ سیانے کو اتار

روکتا تھا نہ جسے غار نہ خندق نہ کواں
تھے ہم اس تو سنِ سر زور پہ دن رات سوار

رہتے تھے اس شترِ مست کی صورت بے قید
ہاتھ سے جس نے شترِ باں کے تڑالی ہو مہار

پندگو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دل سوز
ان کی صحبت سے تھے اتنے ہی زیادہ بیزار

خیر خواہ اور تھے غمخوارِ مربی جتنے
ان کی صورت سے ہمیشہ ہمیں چڑھتا تھا بخار

مل کے ہم جولیوں سے جان میں جان آتی تھی
ہنسنے اور بولنے پر زیست کا تھا اپنی مدار

اب امنگیں ہیں وہ دل میں نہ ترنگیں باقی
تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں لیل و نہار

صدائے گدایانِ قوم

ڈھونڈنے خضر مبارک پے کو یاں آئے ہم
چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم

ڈر ہے جو خوش دل ہیں وہ سن کر نہ ہوں پڑ مردہ دل
سخت عبرت خیز لے کر داستاں آئے ہیں ہم

ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن
لے کے اس کا مردہ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم

علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے
آج اس در پر اسی کے نوحِ خواں آئے ہیں ہم

قوم کھو بیٹھی ہے جو عباسیوں کی یاد گار
جستجو میں اس کی مشعل لے کے یاں آئے ہیں ہم

تا کہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اس لیے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم

خود غرض ٹھیرائیں یا مکار ہم کو یا گدا
ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم

فخر سب بے جا ہیں ان کے قوم ہے جن کی ذلیل
فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

ہے بنی ہاشم کی مہماں پروری ضربُ المثل
اس لیے یاں بن بلائے میہماں آئے ہیں ہم

تشنگی اپنی بھجانی ہو گی اے آبِ حیات
لے کے منہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

مژدہ قدم حضور شاہزادہ ویلز در ہند

مژدہ ہو اہلِ مشرق اب دن پھرے تمہارے
مغرب سے سوئے مشرق آیا ہے مہرِ تاباں
نگدہ کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے
ہے ایسے نگدہ باں پر نگدہ کی جان قرباں

ہندوستان بھی تجھ سے کچھ آج کل نہیں کم
اے معدنِ بزرگی اے خاکِ انگلستان

تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن
ہندی بھی ان دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں

مہماں ہے آج ان کا اس شاہ کا ولی عہد
روئے زمیں کے سلطان جس کے ہوئے ہیں مہماں

شکر یہ عطاءئے مدرسہ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع
 اجمیری دروازہ دہلی بحضور سرجمیس لائل لفٹنٹ گورنر بہادر
 پنجاب از طرف طلبائے اینگلو عربی سکول دہلی

آئیے اے دلی کے دل آرا شہر دعا گو سب ہے تمہارا
 شکر کا ہم کو گو نہیں یارا پر ہے یہ کہنا فرض ہمارا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

ہے دلی کے فخر کا یہ دن شہر میں آیا شہر کا محسن
 وصف تمہارا گو نہیں ممکن رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر کیسے کیسے رعیت پرور
 جن سے ہے ہندوستان منور فخر ہے انگلستان کو جن پر

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

آرکلاک احسان کا پتلا آدمی کی صورت میں فرشتہ
تھا دلی پر فضل خدا کا تم نے جو دلی میں اسے بھیجا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

آب و ہوا سے شہر کی ساری آئی تھی خلقت جان سے عاری
تم نے لگا کر نل اک باری چشمہ حیواں کر دیا جاری

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

یوں تو ہیں سب احسان مسلم سب سے ہے یہ احسان مقدم
تھے تعلیم میں کم سب سے ہم تم نے مدد کی اپنی پیہم

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

جوہلی کے جو خاص وظیفے پانچ برس کو ہم کو ملے تھے
لطف سے میعاد ان کی بڑھا کے جیت لے دل آپ نے ہم سے

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

مدرسہ تھا بے ثور ہمارا تھا نہ کہیں نکلنے کا سہارا
مانگے مانگے پر تھا گزارا مٹ گیا اب خلیجان یہ سارا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکمِ مرمت کا بھجوا یا ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

درس کے کمرے جس میں ہیں اکثر قدرِ ضرورت سے کچھ بڑھ کر
بورڈوں میں رہنے کو ہیں گھر کھیلنے کو میداں ہے سراسر

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

شہر میں جا کالج کو عطا کی کیس اصلاحیں آب و ہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی شرطِ حکومت تم نے ادا کی

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

تم میں ہیں جو موجود فضائل وہ نہیں کچھ محتاجِ دلائل
لوگ سب ان کے دل سے ہیں قائل او! سر لائل او! سر لائل

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے گا

اشعارِ مدحیہ

(بعض سر ڈائمنس انٹرنیشنل لٹریچر گورنر بہادر پنجاب انبالہ کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے)



قیصر ہند کے ہیں سیکڑوں احسان جہاں
اس کا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احساں

حکمران آئے ہیں پنجاب میں اب تک جتنے
ایک سے ایک کا پلہ ہے عدالت میں گراں

جبکہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا اس دم
وقت رخصت تھا ہراک ان کو بہ حسرت نگران

حال جو ہوتا ہے بچوں کا پھڑکڑ کر ماں سے
یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں

جانشین ان کے ہوئے آن کے جب سر لائل
 عہد سابق کو گئے بھول سب ابنائے زماں
 شکر سے عہدہ برآ اس کے نہیں ہو سکتے
 رحم و انصاف ہوا ذات سے جو ان کی عیاں
 اٹھ گیا سر سے جب اس ملک کے سایہ ان کا
 ہاتھ میں آپ نے لی آ کے حکومت کی عناں
 کار فرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ
 معدلت آپ کی اس وقت سے مشہور ہے یاں
 حیدر آباد میں، میسور میں، کلکتہ میں
 نیک نامی کے کیے کام رہے آپ جہاں
 ہے یہ اب آپ سے امید کہ پنجاب میں بھی
 مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہوں گی آساں
 بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈینس بھی
 چھوڑ جائیں گے ہراک دل پہ عقیدت کے نشاں

انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل ربا امیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا
جب دُور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا

وہ عالمِ جوانی جس پر کہ تو ہے مفتوں
جائے گا ٹوٹ جس دم اس کا طلسم سارا

جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تو نے اس کو
تھا جو کہ تجھ کو اپنا آرامِ دل سمجھتا

چل دیں گے جب وہ سارے ان پلبلوں کی مانند
بعد از بہار جو رخ کرتیں نہیں چمن کا

جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ
کون آ کے دے گا تجھ کو اس کے سوا سہارا

بے مہریوں سے تو نے جس کو کیا ہے غمگین
تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آ کے لے گا

جس طرح وہ پرندہ جو فصلِ گل میں جا کر
پھر موسمِ خزاں میں آ کر ہے ہم سے ملتا

دولت اور وقت کا مناظرہ

سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
 تو ہے انسان کی دولت یا میں
 دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
 تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
 اس کی تو خوبیوں میں شک جانے
 لیتے ہیں توشہ عقبنی مجھ سے
 لقب ادبار ہے جانے کا مرے
 علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
 لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
 میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر
 زندہ تا حشر رہا اس کا نام
 وہ سدا خوار و نگوں سار رہا
 اس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
 تو ہے سرمایہ عزت یا میں
 ہے زمانہ میں بڑی بات تری
 وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا
 ہے عجب جس کو خدائی مانے
 سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے
 نام اقبال ہے آنے کا مرے
 مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشوونما
 لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال
 خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر
 چند روز آگئی میں جس کے کام
 جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا
 منہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں

چاہتے ہیں مجھے سب خرد و کلاں
 گرنے ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو
 کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا
 ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں
 جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں
 الغرض ہے مری وہ شانِ عظیم
 جز سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
 تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا
 وقت نے سن کے کہا اے دولت
 ساری تو خوبیوں کی جز ہے مگر
 تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
 کیجیے فرض تجھے گر چشمہ
 میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں
 تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں
 ہے قرابہ ترا گر عطر آگیس
 ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
 لاکھ ماراں سے اگر بھاگے تو

پھرتے ہیں دھن میں مری پیرو جوں
 کسی آغاز کا انجام نہ ہو
 درمیاں گر نہ قدم ہو میرا
 میرے غماض سے ڈرتا ہے جہاں
 ہو اگر شیر تو رو باہ کروں
 کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم
 میری عظمت نہیں باور تجھ کو
 جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا
 شک نہیں اس میں ذرا اے دولت
 اپنی جز کی نہیں کچھ تجھ کو خبر
 اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی
 تو ہوں اس چشمہ کا میں سرچشمہ
 پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں
 تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
 میں ہوں اس عطر کی واللہ زمیں
 تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت
 بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

طاہرِ رشتہ بپا کی صورت
 جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
 جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر
 لیجے ہاتھ اس سے ہمیشہ کو اٹھا
 پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت
 میری ایک ایک پل ان کو ہے عزیز
 ہے مرا جاگتے سوتے انہیں پاس
 مجھ کو سرمایہ دین و دنیا
 ان کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دین
 نہ ارادہ ہو کوئی ان کا تمام
 اور نہ دنیا کبھی ان سے پیتائے
 نہ ہو قدرت میں حج ان کی نہ زکوٰۃ
 نہ خبر ان سے کسی کی لی جائے
 ہے مگر تنگ مجالِ فرصت
 بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

ان کی مٹھی میں ہے تو اے دولت
 نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
 کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
 ایک پل میری اگر دیجے گنوا
 تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
 ہیں اسی واسطے جو اہل تمیز
 میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
 جانتے ہیں حکما و عرفا
 دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
 نہ کوئی کام ہو ان سے انجام
 نہ انہیں دین کی دولت ہاتھ آئے
 نہ ادا صوم ہو ان سے نہ صلوة
 نہ مدد ان سے کچھ اپنی کی جائے
 گن تو ہیں مجھ میں بہت دولت
 بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو

اس میں ہے میرا سراسر نقصاں

کہ ہے انمول مری ایک اک آں

ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جن میں کچھ قدر قلیل

اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل

ان کو ایسوں سے نہیں ملنا روا

جو لیاقت رکھتے ہیں ان سے سوا

اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں

دیکھنا لازم پہاڑ اس کو نہیں

سر میں ہے جگنو کے یہ سوداگر

شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر

چاہیے دن کو نہ نکلے زینہار

ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرمسار

قطعاً تاریخ اور تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

راقم کو فی الواقع تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخریجہ یا تفسیر کے ساتھ اور کبھی حسن اتفاق سے بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادہ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر صرف مصرعے لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر طوعاً و کرہاً یاروں کی فرمائش سے اور کبھی کبھی اپنی اچھ سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔

ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کر کے اس کے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ تو یہ قفل بغیر کنجی کے کھول دے۔ اس نے کہا بھائی میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آہنگری کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کا مطلب اس نقل سے یہ تھا کہ ہم نے خدا کی طلب میں درویشی اختیار کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل اور سیانا بھی بنا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے ملک میں ان لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اور تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی ان سے اس وقت متعلق ہو جاتی ہے جب کوئی مہتمم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً کسی کے اصطلح کی مرمت ہوئی یا گھوڑا اختہ کیا گیا یا کسی کی مینا مرگئی یا مرغ پالی چیتا یا بلی نے بچے دیئے ایسے وقت میں شعرا کو مقابلہ کے امتحان کا موقع مل جاتا ہے۔ جو شخص مادہ تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمائش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا ہے اس کا فی الجملہ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔ راقم چونکہ تاریخ نکالنے میں سدا سے بیٹا تھا اس لیے ہمیشہ اس امتحان سے کتراتا رہا۔ لیکن بری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمائش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی تھیں ان میں سے جس قدر سردست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کر دی گئیں۔ تاکہ دیوان کے ضروری اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہو جائے۔

تاریخِ وفاتِ مرزا غالب مرحوم دہلوی

غالب نے جب کہ روضہ رضواں کی راہ لی
ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا

اس دن کچھ اہلِ شہر کی افسردگی نہ پوچھ
دنیا سے دل ہر اپنے پرانے کا سرد تھا

حالی کہ جس کو دعویٰ تمکین و ضبط ہے
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا

تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستان نزا
عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا

اس قافلہ میں آ کے ملا گو وہ سب کے بعد
انگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نور تھا

ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جانگزا
دل تھا کہ فکرِ سال میں بے صرفہ گرد تھا

ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا
(سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا)

”تاریخ“ ہم نکال چکے پڑھ ”بغیر فکر“
”حقِ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا“

تاریخِ وفاتِ محمد ابراہیم جوان مرگ طالب علم

بی اے کلاس دہلی کالج

محمد براہیم چوں ترکِ جاں گفت
ز نخلِ جوانی ثمرِ برنخورده

بگفتم ز رُوے الم سالِ فوتش
بجاں آفریں جانِ شیریں سپردہ

تاریخِ وفاتِ سید خواجہ ناصر وزیر مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیرِ راہی ملکِ بقا
سب ہوئے اندوہ گینِ شہر کے برنا و پیر

دل نے کہا ہر جگہ پھبتی ہے چیز اک جدا
باغ میں نسرین و گل چرخ پہ مہرِ منیر

عیش میں شعر و غزل سوگ میں تاریخِ مرگ

غیب سے آئی ندا "خلد میں ناصر وزیر"

تاریخِ طبعِ جغرافیہ بے مثال مولفہ
خواجہ سید شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

وہ جغرافیہ جس کی تھی احتیاج
چھپا مژدہ اے طالبانِ کمال

نئی طرز کا ہے یہ جغرافیہ
عمیاں جس سے ہے ربعِ مسکوں کا حال

ملی طرفہ تراں کی تاریخِ طبع
وہ خود طرفہ ہے جیسے بے قیل و قال

اگر سالِ ہجری کی ہے جستجو
تو جغرافیہ خود بتاتا ہے سال

ہو مطلوب تاریخِ گر عیسوی
کہو اس کو جغرافیہ بے مثال

تاریخ بہ پایاں رسیدن بناے سید مہر بالغلے

مرحوم رئیس گلاوٹھی در شہر بلند

علی آں سیدِ والا کہ باشد

بنامش مہرباں جزوے ز اجزا

بود با ذات او توأم سیادت

چناں کز نام او مہرست پیدا

چوایں کا شانہ را بنیاد بہباد

بعہدِ حاکم بیدار و دانا

گروس آں فیض گستر کزو جودش

شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا

چنیں گفتمش حالی سالِ تعمیر

مکانِ بے نظیر آباد بادا

تاریخ اورنگ نشینی حضور آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی

خاں بہادر فرماں روائے ملک دکن

بہ سالِ فرخ و ماہِ سعید و روزِ فرخندہ

نظام الملک محبوب علی خاں آصف ثانی

بہ تختِ سلطنت بنشت و حالی گفت تاریخش

برائے وے مبارک تاج و اورنگِ جہانبانی

تاریخِ تالیف قواعدِ اردو مولفہ

خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

قواعد ہے یہ اردو کی کہ جس کا

بیاں ثانی ہے اور ترتیب محکم

کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی

زیادہ حجم میں اور نفع میں کم

مگر یہ مختصر ہے اک رسالہ
کہ ہیں جس میں قواعد سب فراہم

وجود اس کا ہے گو سب سے مؤخر
پہ خوبی میں ہے اکثر سے مقدم

جو قیمت پوچھیے تو ہے بہت سہل
نہ دینا اس میں لگتے ہیں نہ درہم

اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب
تو ہے اے طالبو "اکسیر اعظم"

تاریخِ رحلتِ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

دردا کہ ضیاء دین احمد بر بست
رختِ سفر از جہاں کہ جائے الم ست

از طاق و ز ایوان و ز بزم و جلسا

۱۱۰ ۶۸ ۴۹ ۹۴

بکستہ بہ رحمتِ الہی۔ پیوست

(۶۰۹۴) (۱۳۰۲ھ)

تاریخِ طبعِ دیوانِ منشی اقبال حسین صاحب متخلص بہ عاشق

جواں مرد آزادہ عاشق کہ نیست

در اقران خود کس مراورا قرین

نہ صیاد و ہموارہ از حسنِ خلق

پئے صیدِ آزادگاں در کیں

نہ سحّار و پیوستہ ز افسونِ نطق
کشد ز اشیاء بازو شیرازِ عریں

ہے بارو از جہہ اش انبساط
اگر مہربان ست و گر خشکیں

نہ تینیش گہ سرکہ بر ابرواں
نہ یا بیش افتادہ چہیں بر جبیں

دو سال ست کا افسون مہر و وفاش
ربو دست مہرم ز جانِ حزین

ولے دیر پیوند نا آشنا
کہ بودست فارغ ز مہر و زکیں

ندانم کہ عاشق چہ افسوں دمید
کہ در باہت خود را بمہرش چنیں

سر رشتہ بیہاتِ دایم ز دست
غمن ز آسماں بود و رفت از زمیں

کنوں رانم از طبعِ دیواں سخن
که شد جلوہ فرما بہ نوعِ گزین

دریں روزها کز صرفِ زماں
سخن شد ہمان و سخنور مہمیں

عروسِ سخن سے نیرزد بجو
بہ حسن ار بود غیرتِ حورِ عین

صد آیاد بر عاشق و عزمِ او
کہ در دورِ ناساز گاری چنین

ز معنی بہ بیگانہ و آشنا
فشان دست گنجینہ از آستین

چو دیوان اردوے عاشق کہ ہست
صنم خانہ طرفہ گفتی زچیں

بہ پیرایہ طبعِ آراستند
شنیدند از ہر کنار آفریں

خُن کش نبود از شے در جہاں
ز شادی نہ گنجید در پوستیں

چو حالی ہے جست تاریخِ طبع
ضم خانہ عاشق آمد سنیں

۷ ۰ ۳ ۱ ۵

تاریخ بنائے چاہ درمحوطہ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ

بحساب سالِ بعثتِ خاتم النبیین ﷺ بحسن سعی جناب

آنرہیل سرسید احمد خاں بہادر

ہدایت کیجیے گر سالِ ہجرت کی محرم سے

تو کہیے سالِ بعثت کا مہ شوال کو مبدا

کلام اللہ اترا آخرِ ماہ مبارک میں

ہوا اس واسطے شوال مبدا سالِ بعثت کا

نکالے یہ مبارک سن جناب سید احمد نے

بنایا جس نے دارالعلم میں یہ چشمہ زیبا

زرے سالِ بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش
کہا ہاتف نے حالی سے کہ ”چشمہ فیض احمد کا“

۱۳۰۱۲ نبوی

تاریخ طبع ترجمہ تاریخ دربارِ قیصری بحساب سالِ عیسوی

پنجاب کے ادارہٴ تعلیمِ عام نے
ایک اور کام ملک کے حق میں کیا ہے خوب

دربارِ قیصری کی جو تاریخ تھی چھپی
اب ترجمہ اسی کا مرتب ہوا ہے خوب

ہیں لفظ دل کشا تو مضامین ہیں دل نشین
ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب

چھپ کر ہوا تمام تو حالی نے یوں کہا
”دربارِ قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب“

تاریخ بنائے مہماں سر اور موضعِ مومن
واقع پنجاب بحساب سالِ عیسوی

بحرِ کرم آں وزیر چند کہ باقی ست
نامِ بزرگانِ مومن زبذل و نوالش

ساختہ منزل گہے چو بہرِ غریباں
تکیہ گہرِ ہر غریب آمدہ سالش

تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

تاریخ وفات غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ مرحوم
دہلوی رئیس جہانگیر آباد متخلص حسرتی و شیفۃ

جَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّاتٍ وَحَرِيرًا

۱۲۷۷ھ

آیہ قرآنی میں بما صبروا جنة وحریراً ہے۔ چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اس لیے جنة کی جگہ جنات کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے روح وریہان و جنة نعیم کے فہنا روح وریحان و جنات النعیم کر دیا ہے۔ چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد و آلام بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے۔ اس لیے اس آیت کا مضمون ان کی وفات کے نہایت مناسب تصور کیا گیا۔ یعنی نواب باری نے بعوض ان کے صبر کے بہشت اور بہشت کا لباس ان کو عنایت کیا۔

تاریخ وفات نواب محمد نقشبند خاں مرحوم ولد اوسط
نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد

وَحَلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ

۱۲۹۴ھ

چونکہ عزیز موصوف ایک وجہ و فکیل آدمی تھے اور ان کی وفات منفوان شباب میں واقع ہوئی تھی اس لیے یہ آیت ان کی تاریخ وفات کے لیے نہایت مناسب اور موزوں سمجھی گئی۔ اللہ تعالیٰ جنت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ ”پہنائے گئے ان کو چاندی کے کنگن“ بجائے منسارح کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا ان کی مغفرت ہو چکی اور اہل جنت کے تمام حقون ان کو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کی تاریخ وفات قرآن مجید سے برآمد ہوئی اور پھر ایک ہی سورت یعنی سورہ دہر سے نکلی اور دونوں آیتیں اہل جنت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بنائے آئینہ خانہ درریاستگاہ بہاول پور

كَانَهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنَ الْقَوَارِيرِ

۱۲۹۶ ہجری

قرآن مجید میں اصل آیت ”انہ صرح ممرود من قواریر“ ہے۔ تاریخ میں ضرورت تکمیل اعداد اور نیز بمتکھائے مقام انہ کی جگہ کانکر دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پورے نہیں ہوتے تھے اس لیے قواریر میں الف لام بڑھا کر القواریر کر دیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں جب سبا کی بادشاہ زادی بلقیس اولیٰ دفعہ وارد ہوئی تو اس کو شیش محل کے صحن پر جس میں آئینے لگے ہوئے تھے۔ یہ گمان ہوا کہ گویا پانی بھرا ہوا ہے۔ اس نے فوراً پائے چڑھا لیے۔ حضرت سلیمان نے کہا ”انہ صرح ممرود من قواریر“ یعنی یہ تو ایک محل ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ تاریخ بنا میں انہ کی جگہ کانکر دینے سے یہ معنی ہو گئے کہ گویا یہ وہی سلمان کا شیش محل ہے۔

یہ تاریخ ایک دوست کی فرمائش سے جو اس وقت بہاول پور میں ملازم تھے بھیجی گئی تھی۔ مگر ایسا سنا گیا تھا کہ پسند نہیں آئی۔ نہ اس لیے کہ اس میں دو جگہ اپنی طرف سے تصرف کیا گیا ہے بلکہ اس لیے کہ نواب صاحب کا نام اس میں نہیں تھا۔

تاریخ وفات جناب مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی غفر اللہ

متخلص بہ عالم

آن قلندر علی وحیدِ زماں
در نجابت زبیری و سندی

خاکِ پانی پت از سکونتِ او
در جہاں شد علم بہ مستندی

مرد و باخویش برو حکمت و علم
ماند خلقے بہ کوئے نابلدی

جز دلِ او کہ بود جملہ صفا
نقد ہر کیہ جید ست وردی

جز کتابش کہ بد ہمہ حسنات
درجِ ہر نامہ نیکی ست و بدی

گفت سالِ وفات او مظہر
رفت عالم بہ جنتِ ابدی

تاریخِ وفاتِ حافظِ سعید اکبر مرحوم بانی مدرسہ اسلامیہ پانی پت

چو سعید اکبر آں یاری گرِ قوم
کہ مر اہلِ وطن را بود یاور

سوے جنت ز دنیا رخت بر بست
ازیں غم تافت دلہا ہم چو آذر

در بلیغ آں نیک خواہِ جملہ احباب
در بلیغ آں نمکسارِ ہر برادر

در بلیغ آں درس گاہِ اہلِ اسلام
کہ ماند از مردش بے برگ و بے بر

چہنیں سالِ وفاتش یافت مظہر
شدہ جنت مقامِ سعیدِ اکبر

تاریخ اورنگ نشینی حضور نواب آصف جاہ نظام الملک میر

محبوب علی خان بہادر دام اقبالہ فرمانروائے دکن

شاہِ دکن چوں نہاد حسبِ مرادِ عباد

افسرِ دولت بہ فرق پائے براورنگ داد

سالِ جلوسِ خرد گفت کہ بے سر شدہ

فتنہ و فسق و فجور شر و فریب و فساد

۱۳۰۱ھ



عیاں شد چو عیدِ جلوسِ نظام

بے خوشتر از عیدِ وصلِ حبیب

خرد فرق اعدا تراشیدہ گفت

کہ "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ"

۱۳۰۱ھ

تاریخ ولادتِ فرزندِ دارِ جمند در کاشانہ اقبال حضورِ نظامِ دامِ اقبال

شد چو خورشیدِ شرف طالع بمشکوے نظام
قدسیاں گفتند شمع ملک و دولت آمدہ

مظہر اندر فکرِ تاریخِ ولادت رفتہ بود
عقل گفت "ایں لعل از کانِ شرافت آمدہ"

۱۳۰۱ھ

تاریخِ مدارِ المہامی نواب میر لایق علی خان مرحوم در سرکارِ عالی

دوشِ کروم ز عقل چند سوال
کوست احوالِ مشکلات و عقد

گفتمش کے بود کہ شاہِ دکن
بنیہند بہ مسندِ آب و جد

گفت جشنِ جلوسِ فرخ او
در ہزارست و سی صدست واحد

گفتمش پس کہ باشدش دیواں
قرعہ بر لایق علی خاں زد

گفتمش سنگہا دریں راہ است
گفت زودا کہ حق بہ خواجہ رسد

گفتمش خواجہ کے شود دیواں
گفت ”حق میرسد بمرکز خود“

۱۳۰۱ھ

تاریخِ بنا و مرمت مسجد مولانا حاجی ابراہیم حسین صاحب
انصاری اثنا عشری پانی پتی دام ظلہم العالی

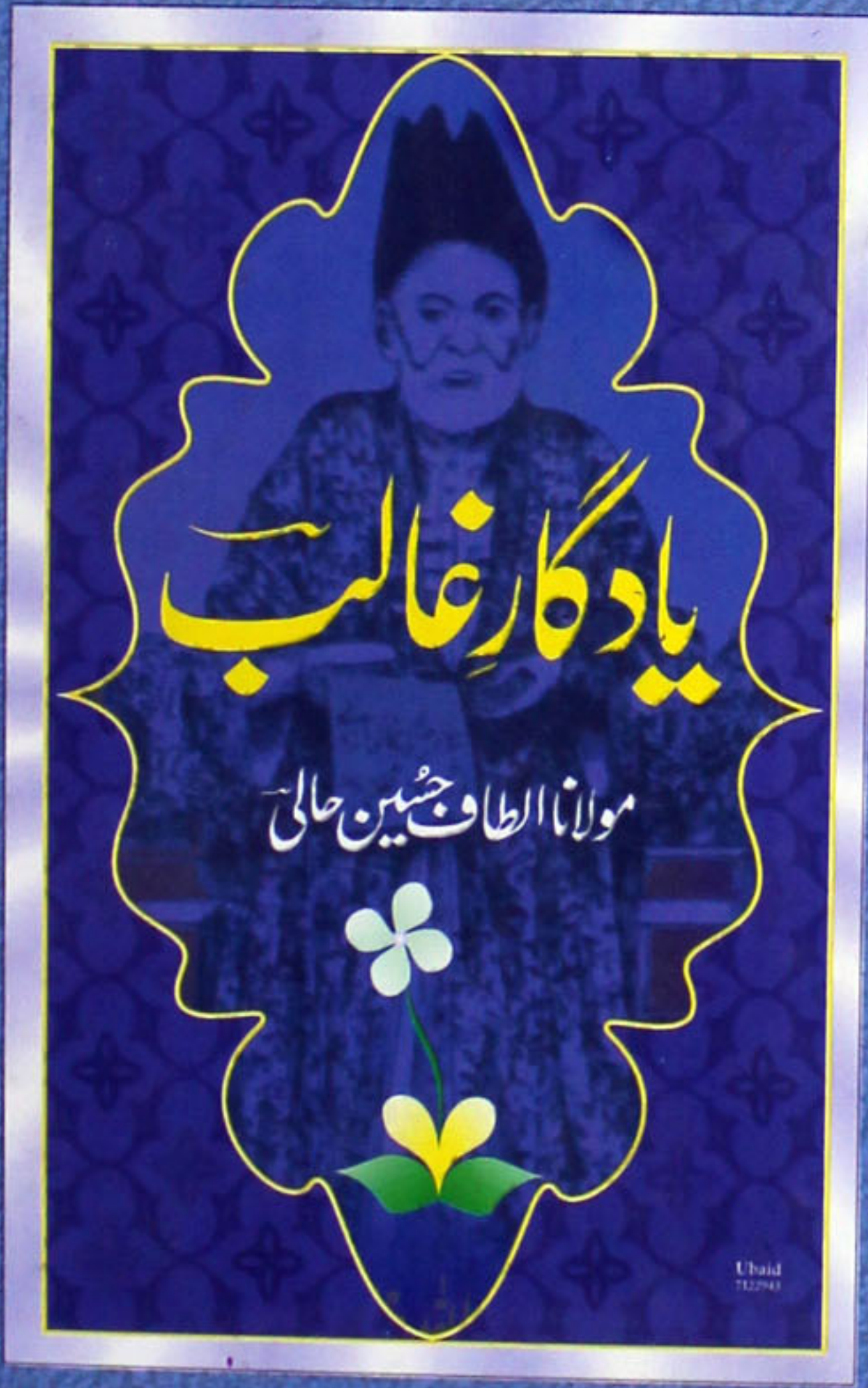
جعفری مذہبے بنا فرمود
بیتِ حق را کہ اعظم ست و قدیم

خبرش داد ملہم صادق
کرد تعمیر کعبہ ابراہیم

۱۳۰۰ھ

بانی مسجد یعنی مولانا ابراہیم حسین صاحب کے والد کا نام اعظم علی اور ان کے چچا کا نام جعفر علی اور دادا کا نام صادق علی تھا۔ یہ تینوں نام اور خود بانی ۰۰ م قطعہ تاریخ میں نہایت خوبی سے آیا ہے۔

۱۵۰/۳	سردار شاہ	اک کی ہی روٹی
۱۳۰/۳	سردار شاہ	اک وادہ بھانا ہے
۱۵۰/۳	سردار شاہ	مہت
۱۵۰/۳	سردار شاہ	نچے پھولوں کی پارش میں
۱۵۰/۳	سردار شاہ	جہاں پھولوں کو کھنقا تھا
۱۵۰/۳	سردار شاہ	پتھر پر پتھر اسے دل
۱۳۰/۳	باقی احمد چاری	مہت کس طرح مہری
۱۳۰/۳	باقی احمد چاری	اب دل ہی نہیں گنا
120/۳	فردت مہاس شاہ	اور اس اور اس
120/۳	فردت مہاس شاہ	پاداؤں اگر وہی میں
120/۳	فردت مہاس شاہ	اکھ بولتے ہیں
120/۳	فردت مہاس شاہ	وہ بول مہت کے
120/۳	فردت مہاس شاہ	شام کے بعد ۳
۱۳۰/۳	شعیب علی سیّد	بھی جو خواب اترے تھے
۱۰۰/۳	آصف شفیق	ازراہ قوم قسم جاتے
۱۰۰/۳	آصف شفیق	ترے سر او پہناتے
۳۰۰/۳	آصف شفیق	روشن فزائیں
۱۳۰/۳	قاروہ تول	پاندے ہاں اور کھایا
۱۳۰/۳	قاروہ تول	کو وہ پاندہ کیسا تھا
۱۳۰/۳	قاروہ تول	تکسین تکسین بھیلی ہی
۱۳۰/۳	قاروہ تول	اب کمرے شہ میں گئے امیر
۱۳۰/۳	قاروہ تول	سندھ پر پھرتا ہوگا
120/۳	قاروہ تول	دور مت نکل جانا
۱۵۰/۳	قاروہ تول	پاندہ اور میں
۱۰۰/۳	زاہد منیر عامر	تراکھن آنکوں میں
۱۳۰/۳	احقر تک	دل بہت اور اس ہے



خزینہ علم و ادب

اکٹومارکیٹ اردو بازار - لاہور ۷۴۱۰۱۹

